معارف الحدیث

یعنی

احادیث نبوی کا ایک جدید اور جامع انتخاب

اردو ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

دار الاشاعت اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان

معارف الحدیث

یعنی

احادیثِ نبوی کا ایک جدید اور جامع انتخاب

اُردو ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ

جلد اول

کتاب الایمان

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

دارالاشاعت

طباعت کمپیوٹرایڈیشن : اپریل ۲۰۰۷ء

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

پریس : علمی گرافکس کراچی

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121 HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF HOUSTON
TX 77074 U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET
BUFFALO NY 14212 U.S.A.

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ از نبیِّ اُمّیِ پیغام دہ

پیشکش

اُن سب اخوان دینی کی خدمت میں ——— جو "نبی اُمی" سیدنا حضرت محمد

عربی (فداہُ اُمی وابی وروحی وقلبی) ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں

اور آپ ﷺ کی ہدایت اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں اپنی اور تمام اولادِ آدم

علیہ السلام کی نجات کا یقین رکھتے ہیں

اور اس لئے آپ ﷺ کی تعلیم اور طرزِ زندگی سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں

آیئے

علم و تصور ہی کے راستہ سے مجلسِ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر

آپ ﷺ کے ارشادات سنیں

اور

اس چشمۂ انوار سے

اپنے تاریک دلوں کیلئے روشنی حاصل کریں

عاجز وعاصی

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

فہرست مضامین جلد اول —— "حصہ اول"

دیباچہ

از مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلاَمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب و بے شمار احسانات فرمائے ہیں اُن میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی صلاح و فلاح کے لئے نبوت و رسالت کا مقدس و مبارک سلسلہ جاری فرمایا اور جب جب انسانوں کو آسمانی ہدایت کی ضرورت ہوئی اُن ہی میں سے کسی بندہ کو اپنا نبی اور اُن کا ہادی بنا کر اپنی ہدایت کے ساتھ اُن میں بھیج دیا۔

انبیاء و مرسلین کی آمد کا یہ سلسلہ ہزاروں سال جاری رہا یہاں تک کہ خاتم النّبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سلسلہ کو ختم فرمادیا گیا اور آپ کے ذریعہ وہ آخری اور مکمل تعلیم و ہدایت بھیج دی گئی جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہونے والی ہے۔

خداوندی تعلیم و ہدایت کا جو سرمایہ خاتم النّبیین ﷺ کے ذریعہ دنیا کو ملا اُس کے دو حصے ہیں ایک کتاب اللہ، قرآن مجید جو لفظاً و معنًی کلام اللہ ہے۔

دوسرے آپ کے وہ ارشادات اور آپ کی تمام قولی و عملی ہدایات و تعلیمات جو آپ اللہ کے نبی و رسول اور اُس کی کتاب کے معلم و شارح اور اُس کی مرضی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے امت کو دیتے تھے جس کو صحابۂ کرامؓ نے محفوظ رکھ کر بعد والوں کو پہنچایا اور بعد والوں نے اُس کو پورے سلسلۂ روایت کے ساتھ کتابوں میں محفوظ کردیا...... آپ کی تعلیمات و ہدایات کے اس حصہ کا عنوان حدیث اور سنّت ہے۔

رسول اللہ ﷺ تو اپنی عمر طبعی گزار کے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن انسانی دنیا کی ہمیشہ کے واسطے رہنمائی کیلئے اپنی لائی ہوئی تعلیم و ہدایت کے یہ دونوں حصّے یعنی قرآن اور سنّت اپنے پیچھے چھوڑ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے (اپنے اپنے درجہ کے مطابق) ہر دور میں محفوظ اور روشن رہنے کے ایسے ظاہری و باطنی انتظامات فرمائے کہ غور و فکر کرنے والوں اور سمجھنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے وہ ایک بڑی نشانی اور خاتم الانبیاء ﷺ کے معجزوں میں سے ایک زندہ معجزہ ہے۔

انہی خداوندی انتظامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس دور میں کتاب و سنّت کی جس قسم کی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے دلوں میں اُس کا داعیہ پیدا کر کے اُن کو اُس طرف متوجہ فرمادیتے ہیں...... عہد نبوی سے لے کر اس وقت تک قرآن و حدیث کی خدمتیں جن جن شکلوں میں انجام دی گئی ہیں، اگر کوئی تفکّر کی نگاہ سے دیکھے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ جو کچھ ہوا ہر دور کی ضرورتوں کا

ایک تھا اور جن بندوں کے ذریعہ ہوا وہ گویا صرف آلۂ کار تھے

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ۔ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اس اجمال کی تفصیل اگرچہ بہت لذیذ اور ایمان افروز ہے مگر بہت طویل ہے اور اہل فہم کے لئے اتنا اشارہ ہی کافی ہے اس لئے اسی پر اکتفا کر کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہمارے اسی دور اور ہمارے ہی ملک میں اپنے بعض بندوں سے اردو زبان میں قرآن مجید کی ایسی خدمتیں کرائیں جن کی اس دور میں خاص ضرورت تھی اور الحمد للہ کہ ان بندگانِ خدا کی ان محنتوں سے اس وقت کی ضرورت پوری ہو گئی، اسی طرح اب سے قریباً بارہ برس پہلے (۱۳۶۱ھ میں) اس عاجز بندہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس زمانہ کے خاص حالات وضروریات کا لحاظ رکھ کر اردو میں حدیثِ نبوی کی بھی ایک خدمت کی جائے اور اس کے لئے موجودہ کتبِ احادیث (صحاح یا مشکوٰۃ وغیرہ) میں سے کسی کی اردو شرح لکھنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ احادیثِ نبویہ کا ایک متوسط درجہ کا جدید مجموعہ خاص اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر خود ترتیب دیا جائے اور اپنے زمانے کے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی دینی، علمی اور ذہنی و فکری حالت اور عصرِ حاضر کے خاص علمی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر عام فہم اردو زبان میں حدیثوں کی تشریح کی جائے ... چنانچہ اس کام کا ایک خاکہ اور معیار سامنے رکھ کر بنام خدا اسی سال یہ کام شروع بھی کر دیا اور کبھی کبھی ماہوار رسالہ میں اس کے حصے کے زیر عنوان شائع بھی ہوتے رہے۔

لیکن ان سالوں میں اس عاجز کے حالات مسلسل ایسے رہے کہ اس کام کی رفتار بہت سُست رہی بلکہ درمیان میں زیادہ مدت اس حال میں گزری کہ میں اس کام کی طرف بالکل توجہ نہ کر سکا، یہاں تک کہ مجھے بالکل امید نہ رہی کہ میں اس کام کو کسی حد تک بھی پہنچا سکوں گا، لیکن کام لینے والے کا فیصلہ کام لینے کا تھا اس لئے بار بار کے انقطاع اور کئی کئی برس کے درمیانی وقفوں کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ پہلی جلد جو اس وقت شائع ہو رہی ہے، اب سے قریباً ڈیڑھ سال پہلے کسی طرح مکمل ہوئی، اس کے بعد نظرِ ثانی کے لئے فُرصت کا انتظار رہا، خدا کے فضل و توفیق سے یہ کام بھی ہو گیا اور اس کے بعد کتابت وطباعت کے مرحلے بھی اس کے کرم نے آسان فرما دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے اگر اس کتاب کی تکمیل کی توفیق بخشی تو میرے سوچے ہوئے خاکے اور اندازے کے مطابق یہ انشاء اللہ ایسی ایسی پانچ جلدوں میں ختم ہو گی۔

یہ پہلی جلد ہے اس میں صرف ان احادیث کو درج کیا گیا ہے جن کا تعلق ایمان سے ہے ..... البتہ قیامت، آخرت، جنت اور دوزخ کے سلسلے کی احادیث کو کتبِ حدیث میں عام طور سے کتابُ الایمان سے الگ درج کیا گیا ہے، اس عاجز نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کو بھی کتابُ الایمان ہی کا جزو بنایا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے اور اس جلد کی پوری نصف حدیثیں مابعد الموت یعنی برزخ و قبر اور قیامت و آخرت میں پیش آنے والے واقعات، حساب، کتاب اور جنت ودوزخ وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، گویا یہ وہ حدیثیں ہیں جن سے کی تفصیل وتشریح معلوم ہو گی۔

اس کتاب میں حدیثیں عام طور سے "مشکوٰۃ المصابیح" ہی سے لی گئی ہیں۔ صرف چند حدیثیں (شروع کے ۶۰ صفحات کے اندر ہی اندر) ایسی بھی ہیں جو مشکوٰۃ سے نہیں لی گئی ہیں بلکہ براہ راست اُن کتابوں سے لی گئی ہیں جن سے ان کی تخریج کی گئی ہے، پس اس کتاب کی جو حدیث مشکوٰۃ میں نہ پائی جائے یا مشکوٰۃ کی مندرجہ کسی حدیث اور اس کتاب کی منقولہ حدیث کے الفاظ میں کوئی فرق یا کمی بیشی ہو تو سمجھ لیا جائے کہ یہ اصل کتاب سے براہ راست نقل کی گئی ہے۔

ناظرین کی سہولت کیلئے حدیثوں کو عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر عنوان احادیث کا مطلب و مقصد سمجھنے میں بھی ناظرین کی بہت کچھ مدد کرنے والے ہیں۔

کتاب چونکہ عام تعلیم یافتہ اردو خواں مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے حدیثوں کی ترتیب میں بھی بجائے درجۂ روایت اور مرتبۂ صحت کے اس کا لحاظ کیا گیا ہے کہ حدیثوں کا مقصد و مدعا سمجھنے میں ناظرین کو ترتیب سے بھی مدد ملے تاہم حدیث کی کسی کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ کتاب کے مرتب کرنے والے نے جس ترتیب سے حدیثوں کو درج کیا ہے وہ اُس کی اپنی صوابدید ہے، ورنہ ہر حدیث بجائے خود ایک مستقل افادہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ حدیث کی کسی کتاب کے ایک ہی صفحہ پر اور ایک ہی عنوان کے تحت برابر برابر درج ہونے والی دو حدیثوں میں سے ایک زمانۂ نبوت کے بالکل شروع کی ہو اور دوسری رسول اللہ کے آخری زمانۂ حیات کی ہو۔

اسی طرح حدیث کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ زیادہ تر احادیث کی حیثیت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے مجلسی ارشادات اور افادات ہیں یا آپ کے سامنے پیش ہونے والے سوالات کے جوابات ہیں یا کسی وقتی مسئلہ سے متعلق ہدایات اور تنبیہات ہیں، اس لئے اس موقع و ماحول اور مخاطبین کے احوال و خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر احادیث کی اس حیثیت کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرح ان پر بھی غور کیا جائے تو طرح طرح کی اُلجھنیں اور شکوک پیدا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ نکتہ ملحوظ رکھا جائے گا تو انشاء اللہ کوئی اُلجھن اور کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوگا۔

چونکہ اس تالیف کا اصل مقصد رسول اللہ کی اس تعلیم و ہدایت کو جو ذخیرۂ حدیث میں محفوظ ہے اس زمانہ کے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پہنچانا اور سمجھانا اور اُن کے لئے اتباع نبوی کی راہ آسان کرنا ہے اسلئے متن حدیث کے ترجمہ میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے بلکہ حدیث کے مقصد و مفہوم کا واضح کرنا پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس واسطے ترجمہ و تشریح میں زبان بھی حتی الوسع آسان استعمال کی گئی ہے۔

جن حدیثوں کے بارے میں کسی طبقے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں یا کچھ گمراہ کن لوگ اُن کے ذریعہ مسلمانوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں ان کی تشریح میں ان کے ازالہ کی خصوصیت سے کوشش کی گئی ہے مثلاً بعض حدیثوں میں صرف "لا الٰہ الا اللہ" کہنے پر جنت کی بشارت دی گئی ہے یا کلمہ پڑھنے والے پر آتشِ دوزخ حرام ہونے کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ اسی طرح بعض حدیثوں میں ایسے شخص کی تکفیر سے

منع فرمایا گیا ہے جو مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہو اور اُن کے قبلہ کو اپنا قبلہ مانتا ہو، اور اس کے برعکس بعض حدیثوں میں بعض گناہوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا کرنے والا مسلمان ہی نہیں اور ایمان میں اُس کا کوئی حصہ ہی نہیں...... الغرض اس طرح کی مشکل اور شرح طلب حدیثوں کی تشریح اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی خاص مدد سے ایسی ہو گئی ہے کہ انشاءاللہ اس کے مطالعہ کے بعد کسی کے لئے مغالطہ کی گنجائش نہیں رہے گی، الّا یہ کہ کسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور راست روی مقدّر ہی نہ ہو اور اُس کے واسطے کج روی ہی کا فیصلہ مِن جانبِ اللہ ہو چکا ہو۔

حدیث نمبر ۱ سے لے کر نمبر ۷۰ تک یعنی شروع کتاب سے صفحہ نمبر ۱۲۰ تک کسی عنوان کے تحت متن حدیث سے پہلے کوئی تمہیدی نوٹ نہیں لکھا گیا ہے نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی ہے...... لیکن آگے صفحہ ۱۲۱ سے آخر تک جو حدیثیں عالم برزخ، عذابِ قبر، اور قیامت و آخرت سے متعلق ہیں اُن کی تفہیم کے لئے اصل حدیث سے پہلے جہاں جہاں تمہیدی اور تفہیمی نوٹ لکھنا ضروری معلوم ہوا ہے وہاں اس قسم کا نوٹ لکھ کر ناظرین کے ذہنوں کو صاف اور مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ برزخ، قیامت، صراط، میزان، حوضِ کوثر، شفاعت، جنت، دوزخ اور دیدارِ خداوندی سے متعلق جو مفصّل تمہیدی نوٹ ان غیبی حقائق کے سلسلہ میں اصل حدیثوں کے درج کرنے سے پہلے لکھے گئے ہیں امید ہے کہ ناظرین کیلئے انشاءاللہ وہ بہت زیادہ اطمینان اور ازدیادِ ایمان کا باعث ہوں گے۔

آخری گزارش

اپنے با توفیق ناظرین سے یہ ہے

کہ حدیث کا مطالعہ خالص "علمی سیر" کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے بلکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لئے اور عمل کرنے اور ہدایت حاصل کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ نیز مطالعہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کی عظمت و محبت کو دل میں ضرور بیدار کیا جائے اور اس طرح ادب و توجہ سے پڑھا جائے یا سنا جائے کہ گویا حضورؐ کی مجلسِ اقدس میں حاضر ہیں اور آپ فرما رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں...... اگر ایسا کیا گیا تو اس کے انوار و برکات انشاءاللہ نقد نصیب ہونگے۔

آپ سب کی دعاؤں کا محتاج اور طلبگار

عاجز و گنہگار بندہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۳ھ

مطابق ۲۵ فروری ۱۹۵۴ء

دین میں حدیث و سنت کا مقام

مقدمہ سے پہلے ان سطروں کو پڑھ لیجئے

جو نئی نئی گمراہیاں ہمارے اس زمانہ میں پیدا ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں نے جنگلی آزادی پسند طبیعتوں کیلئے احکامِ شریعت کی پابندی سخت گراں اور شاق ہے یہ نعرہ لگانا شروع کیا ہے کہ ...... دینی حجت بس قرآن ہی ہے، قرآن کے لانیوالے رسول کا کام بس قرآن پہنچا دینا تھا، اب ہمارا کام بس قرآنی احکام کی تعمیل کرنا ہے اور اُس سے باہر اور اُسکے علاوہ کوئی چیز حجت دینی نہیں ہے، حتیٰ کہ رسول کا قول و فعل بھی دینی حجت اور واجب الاتباع نہیں ہے یعنی احادیثِ نبوی اور اسوۂ حسنۂ رسالت پر کسی دینی مسئلہ اور کسی شرعی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ کسی ہستی کو اللہ کا نبی و رسول مان کر اُس کی تعلیمات و ہدایات اور اُس کے اسوۂ حسنہ کو دینی حُجت اور واجب الاتباع نہ ماننا اس قدر مُہمل اور ایسی غیر معقول بات ہے کہ اگر اس کے کہنے والے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے ہوتے اور اُن کی یہ باتیں خود اُن سے نہ سنی ہوتیں تو اس کا یقین کرنا بھی دشوار ہوتا کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسی مہمل بات بھی کہہ سکتا ہے ..... مگر کیا کیا جائے کہ دنیا کے اس عجائب خانہ میں جہاں اور بہت سے عجائبات ہیں اُن ہی میں سے ایک یہ اعجوبہ بھی ہے کہ بظاہر عقل و حواس رکھنے والے کچھ لکھے پڑھے لوگ سمجھ میں نہ آسکنے والی یہ بات بھی پورے زور سے اور چیخ چیخ کے کہہ رہے ہیں۔

اس فتنہ کو اپنی غیر معقولیت کی وجہ سے آپ اپنی موت مر جانا چاہئے تھا لیکن چونکہ اقوامِ مغرب کی سیادت و قیادت کی وجہ سے ہمارے اس زمانہ کی ہوا آزادی پسندی اور آوارہ مزاجی کے لئے ہمیشہ سے زیادہ سازگار بنی ہوئی ہے اس لئے یہ فتنہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ کسی نہ کسی رفتار سے کچھ بڑھ ہی رہا ہے۔ "معارف الحدیث" جو ذخیرۂ احادیث نبوی کا ایک انتخاب ہے ..... جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور تعلیمات و ہدایات کو اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ اُردو خواں طبقہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے ...... مناسب سمجھا گیا کہ اس کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے اس کے لئے ناچیز مؤلف نے اپنے علمی محسن اور استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے استدعا کی، ممدوح نے اس کو قبول فرمایا اور یہ مقدمہ تحریر فرمایا جو آئندہ صفحہ سے شروع ہو رہا ہے۔

مؤلف

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بلا شبہ قرآن پاک دین و شریعت کی اصل و اساس ہے اور ادلّہ شرع میں وہی سب سے مقدّم اور سب سے محکم ہے، مگر اس کا کام صرف اصول بتانا ہے، تفریع و تفصیل اور توضیح و تشریح حدیث و سنت کا وظیفہ ہے۔ ہر باخبر جانتا ہے کہ قرآن کریم امت کو بلاواسطہ رسول نہیں دیا گیا تھا کہ لو تم بذاتِ خود یا اپنے ہی جیسے غیر نبی لوگوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو، بلکہ اسکے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیج کر ان پر قرآن نازل کیا گیا اور یہ صرف اسلئے کیا گیا تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ صرف رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ کی اُس کتاب کو سمجھیں، چنانچہ قرآن پاک ہی میں ارشاد ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل ١٦: ٤٤)

اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب کو) تاکہ آپ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی انکی طرف اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

اور پھر قرآن ہی کے ذریعہ رسول کے فرائض اور ان کے منصب سے دنیا والوں کو آگاہ کیا گیا اور بار بار اعلان کیا گیا کہ یہی تم کو قرآن کے کلمات و حروف سنائیں اور یاد کرائیں گے اور یہی تم کو اس کے معانی و مطالب اور رُموز و حِکَم بھی بتائیں گے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرة ٢: ١٥١)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب و حکمت اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

بے تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جبکہ بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران ٣: ١٦٤)

کہ تلاوت کرتا ہے ان پر اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب و حکمت اور بالیقین تھے وہ اس سے پہلے گمراہی میں۔

تیسری جگہ ارشاد ہوا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

وہی وہ ذات ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	اُس کی آیتیں اور اُن کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی اُن کو تعلیم دیتا ہے بالیقین وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

ان تینوں آیتوں میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں:

تلاوتِ آیات — تعلیم کتاب

پہلی چیز یعنی تلاوتِ آیات کا مطلب تو ظاہر ہے، ہاں تعلیم کتاب کی نسبت غور کرنا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد بھی قرآن پاک کے مربوط و مرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی ہے تو یہ تلاوتِ آیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوئی، حالانکہ وہ اس سے الگ ذکر کی گئی ہے۔ پس یقیناً اس سے مراد آیات کی تشریح، اس کے معانی و مطالب کی توضیح اور آیات کے حکم اور احکام کا بیان ہے۔

پس جب قرآن ہی سے یہ معلوم ہو چکا کہ آنحضرت کے فرائضِ رسالت میں جس طرح الفاظ و کلماتِ قرآن کی تلاوت و تبلیغ ہے اسی طرح اُس کے معانی و مطالب کا بیان بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہے، تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح متن قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریحات بھی حجت اور واجبُ القبول ہیں، ورنہ آپکو تعلیم کتاب کا مکلّف بنانا اور تعلیم کتاب کو آپ کا منصبی وظیفہ بتلانا بالکل بے معنی ہوگا..... الغرض ان قرآنی نُصُوص کی رُو سے رسول اللہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہونے کے ساتھ اُس پیغام کے معلّم اور مبیّن بھی ہیں۔

اور جب قرآنی نصوص سے آپ کا معلّم و مبیّنِ قرآن ہونا ثابت ہو چکا تو جو شخص آپ کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہے جس طرح اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے متنِ قرآن کی تلاوت و تبلیغ فرمائی اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے اس کی تعلیم و تبیین بھی فرمائی اور چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آنحضرت اُس کے آخری نبی ہیں اور اب کوئی نئی کتاب اور کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اسلئے آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک ہر دور میں محفوظ و باقی رہنا ضروری ہے اور جب اس کی بقا ضروری ہے تو اُس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے آنحضرت کی قولی و عملی تشریحات و توضیحات کا بھی ہر دور میں منقول و مُتداول اور موجود رہنا ضروری ہے۔

اب تک ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

قرآنی نصوص کی رُو سے رسولِ خدا قرآن کے معلّم و شارح و مبیّن ہیں۔

آپ نے جس طرح متنِ قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح اس کی شرح و تبیین بھی فرمائی۔

آپ کی تشریحات و بیانِ قرآن کا قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہنا ضروری ہے۔

اسکے آگے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آنحضرت نے قرآن کی تعلیم دو طرح دی ہے: آپ نے اپنے فعل و عمل سے بھی اس پر عمل کرنے کی صورت سکھائی اور اس کا مفہوم سمجھایا ہے اور اس کی قولی تشریح بھی فرمائی ہے عملی تشریح کی صورت یہ تھی کہ قرآن میں ایک حکم نازل ہوا آپ نے اُس حکم پر عمل کر

کے لوگوں کو دکھادیا جس کی وجہ سے الفاظ قرآن کا مفہوم بھی متعین ہو گیا اور جس بات کا حکم ہوا ہے اس کا عملی نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آ گیا، مثلاً قرآن پاک میں اقامت صلوٰۃ کا تاکیدی حکم نازل ہوا اور اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی (مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت وغیرہ) کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا مگر ان اجزا کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں کہیں ذکر نہیں کی گئی پس ان اجزا کو خاص ترکیب کے ساتھ باہم مربوط کر کے نماز قائم کرنے کی ایک خاص شکل آنحضرت ﷺ کے عمل سے متعین ہوئی۔

قرآن پاک میں "اقیموا الصلوٰۃ" کا حکم دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس حکم پر عمل کس طرح کیا جائے اور اقامت صلوٰۃ کا کیا طریقہ ہے؟ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: صلوا کما رأیتمونی اصلی۔ تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو گویا اسی سوال کا جواب ہے۔

نیز حکم "اقیموا الصلوٰۃ" کی اس عملی تشریح کے علاوہ کبھی کبھی آپ نے اقامت صلوٰۃ کی ترکیب زبانی بھی ارشاد فرمائی ہے۔

اسی طرح مثلاً قرآن پاک میں حج کو فرض قرار دیا گیا مگر حج کا طریقہ اور ترتیب وار اس کے ارکان و مناسک نہیں بیان کئے گئے تو آنحضرت ﷺ نے حج کر کے دکھادیا کہ اس طرح اس فریضہ کی بجا آوری ہونی چاہئے اور اسی لئے کہ قرآن کی تشریح و تبیین صرف آپ ہی کے قول یا عمل سے ہو سکتی ہے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں جہاں سارے حجاج تھے اعلان فرمایا:

خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ لَعَلِّیْ لَا اَرَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا　　لوگو! تم سب حج کے مناسک مجھ سے سیکھ لو! شاید اس سال کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں

پھر قولی تشریح کی بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک کی کسی آیت کا ذکر یا اس کی طرف اشارہ کر کے اُس کی تفسیر یا اُس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے اُس کو بیان فرماتے تھے اور دوسری صورت یہ تھی کہ اپنے وہبی علم اور فہم مخصوص کی بناء پر جو استنباط و استفادہ آپ نے قرآن کریم سے کیا اس کو آیت کا حوالہ دیئے اور اس کی طرف اشارہ کئے بغیر بیان کر دیتے تھے۔

پہلی صورت کی کثیر التعداد مثالوں میں سے صرف تین مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱)　آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح کو حق تعالیٰ پکارے گا وہ کہیں گے، "لبیک وسعدیک یا رب" خدا پوچھے گا تم نے ہمارا پیغام پہنچادیا تھا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! اس کے بعد ان کی اُمت سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس نوح نے ہمارا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تب خدائے تعالیٰ حضرت نوحؑ سے مخاطب ہوگا کہ تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد ﷺ اور اُن کی امت۔ اسکے بعد اُمتِ محمد یہ گواہی دے گی کہ حضرت نوحؑ نے پیغام پہنچادیا تھا اور امت کی گواہی کی تصدیق رسول کرے گا (یعنی میں کروں گا) آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد: وجعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی

النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا میں یہی بیان ہے۔
(صحیح بخاری کتاب التفسیر بروایت ابو سعید خدریؓ)

۲) حضرت عدی بن حاتمؓ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ الخيط الابيض اور الخيط الاسود سے دو دھاگے مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا "لا بل سواد الليل وبياض النهار" نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

۳) حدیبیہ کے سفر میں حضرت کعب بن عجرہؓ کے سر میں بے انتہاء جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی تکلیف و مشقت میں مبتلا ہو گئے ہو، کیا ایک بکری تم پا سکتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ اچھا سر منڈوا ڈالو اور تین روزے رکھ لو، یا چھ مسکینوں کو فی مسکین ایک صاع کے حساب سے صدقہ دیدو۔ (بخاری کتاب التفسیر)

اس واقعہ میں بظاہر آیت کا حوالہ یا اشارہ نہیں ہے مگر "فمن كان منكم مريضا او به اذى من رأسه ففدية من صيام او صدقة او نسك" کا نزول چونکہ اسی واقعہ میں ہوا ہے اس لئے ہم نے اس مثال کو بھی اسی ضمن میں ذکر کیا۔

قرآن پاک کی قولی تشریح کی دوسری صورت میں احادیث نبویہ کا اکثر حصہ یا ان کی بہت بڑی تعداد داخل ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ایسی حدیثوں کا قرآنی ماخذ اپنے علم و عقل کی کوتاہی اور قصورِ فہم کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایسی حدیثوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن کا قرآنی ماخذ تھوڑی سی توجہ اور تامل سے سمجھ میں آجاتا ہے کم از کم دو مثالیں ناظرین اس کی بھی ملاحظہ فرمالیں۔

۱) رسول خدا ﷺ کا ایک ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ

تم میں سے کوئی اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہ ہوگا جب تک کہ اس کی خواہش اور رجحان اُس تعلیم و ہدایت کا تابع نہ ہو جائے جس کو میں لایا ہوں۔

اسکی نسبت بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ارشاد قرآن کی حسبِ ذیل آیتوں سے مستفاد ہے

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء ٤:٦٥)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مؤمن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اُٹھے پھر نہ پائیں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

وَمَاكَانَ لِمُؤْ مِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (احزاب ۳۳ ۳۶)

اور کام نہیں کسی ایمان والے مرد کا اور نہ ایمان والی عورت کا جبکہ فیصلہ کر دیں اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا یہ کہ انکو رہے اختیار اپنے اس معاملہ میں (یعنی اللہ ورسول کے حکم کے بعد ایمان والوں کا کام صرف تسلیم واطاعت ہے اس کے سوا کچھ نہیں)

۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهٗ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا

جو شخص زاد راہ اور ایسی سواری پائے جو اسکو بیت اللہ تک پہنچادے پھر بغیر حج کئے مر جائے تو اس پر کچھ مشکل نہیں کہ یہودی ہو کر مر جائے یا نصرانی ہو کر۔

(رواہ الترمذی عن علیؓ ویزید ما رواہ الدارمی عن ابی امامۃ)

اس کی نسبت خود ترمذی کی روایت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ قرآن پاک کی آیت "ولله على الناس حج البيت ۔۔۔ الآية" سے مستنبط ہے، مگر روایت میں چونکہ پوری آیت مذکور نہیں ہے اس لئے بہت سے لوگوں کو وجہ استنباط سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے، پوری آیت سامنے ہو تو اس کے آخری حصے سے صاف وہ تہدید مفہوم ہوتی ہے جو حدیث میں مذکور ہے، سنئے پوری آیت یوں ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۳۔۹۷)

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا بیت اللہ کا اُن پر جو استطاعت رکھتے ہوں اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو کوئی کفر کا طریقہ اختیار کرے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہاں کے لوگوں کی۔

اس قسم کی اور بھی کثیر التعداد مثالیں پیش ہو سکتی ہیں، مگر اس وقت چونکہ ہمارا موضوع سخن یہ نہیں ہے اس لئے ان ہی دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ احادیث نبویہ کا اکثر حصہ قرآن پاک کی تشریح یا تفصیل یا اس سے استنباط ہے جو "تعلیمهم الکتاب" اور "لتبین للناس ما نزل الیهم" جیسے نصوص کے بموجب آنحضرت ﷺ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے اور یہی قرآنی نُصوص و بیّنات ہم کو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تشریحات و تفریعات اور استنباطات بھی واجبُ القبول اور واجب الاتباع ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی بیان کی ہوئی ایک اور حقیقت پر غور کیجئے۔

تعلیم حکمت

قرآن کریم نے تعلیم کتاب کیساتھ تعلیم حکمت بھی آنحضرت ﷺ کا ایک فریضہ بتایا ہے، یہ حکمت کیا چیز ہے؟ اسکو سمجھنے کیلئے فکرِ صحیح اور فہم سلیم کی ضرورت ہے۔ حکمت کی مراد معلوم کرنے کیلئے سب سے

پہلے خود قرآن پاک کی طرف رجوع کیجئے تو اس میں آپکو ایسی متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ نے اتارا اور نازل کیا ہے، مثلاً سورۂ نساء میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء ٤: ١١٣)

اور نازل کی اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اور سکھایا تجھ کو وہ جو تو نہیں جانتا تھا اور ہے اللہ کا فضل تجھ پر بڑا۔

سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ۔ (بقرہ ۲: ۲۳۱)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت اپنے اوپر اور جو نازل کی تم پر یعنی کتاب اور حکمت نصیحت کرتا ہے اللہ تم کو اس کے ساتھ۔

سورۂ احزاب کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہراتؓ کے گھروں میں ہوتی تھی ارشاد ہے:

وَاذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب ۳۳: ۳٤)

اور یاد کرو اسکو جسکی تلاوت ہوتی ہے تم پر تمہارے گھروں میں یعنی اللہ کی آیتیں اور حکمت۔

سوال یہ ہے کہ ازواج مطہراتؓ کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی تھی؟ اور آنحضرت ﷺ ان کو قرآن کے علاوہ کیا سناتے تھے؟

اس سوال کا صرف یہی ایک جواب ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی حدیث اور آپ کی سنت تھی (یعنی آپ کے عام دینی نصائح اور دینی افادات وارشادات) اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے ذکر کا (یعنی اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا) حکم ہے اسلئے اسی آیت سے حدیث و سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی تقریباً بدیہی اور مسلم ہے کہ علم وذکر وحفظ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ عمل کیلئے مقصود ہیں اس لئے اسی آیت سے حدیث و سنت پر عمل کا واجب اور مامور بہ ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے تو اس سے پہلی آیتوں سے (جن میں کتاب کی طرح حکمت کو بھی منزل من اللہ فرمایا گیا ہے) ثابت ہوا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم معلم قرآن ﷺ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو جس طرح قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ ایک اور چیز بھی (جس کا نام حکمت ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اُتاری ہے، اسی طرح معلّم قرآن ﷺ کی تعلیمات بھی ہم کو یہی بتلاتی ہیں۔

اَلَا اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ

کہ مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اُس کے ساتھ ایک اور چیز بھی اُس کے مثل دی گئی۔

(رواہ ابو داؤد و ابن ماجة والدارمی عن المقدام بن معد یکرب)

کتاب و سنت کے انہیں نصوص کی بناء پر تمام ائمہ و علمائے سلف اس بات پر متفق ہیں کہ "یعلمہم الکتاب والحکمۃ" اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمۃ کا لفظ وارد ہوا ہے اس سے مراد سنت ہی ہے اور سنت بھی وحی الٰہی کی ایک قسم ہے، چنانچہ علامہ ابن قیم کتاب الروح میں لکھتے ہیں:

اِنَّ اللہَ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی "انزل عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَحیین وَاَوْجَبَ عَلٰی عِبَادِہِ الْاِیْمَانَ بِھِمَا وَالعمل بِمَا فِیھا وَھما الکِتٰب والحکمۃ" وَقال تعالیٰ "وانزل اللہ علیك الکتاب والحکمۃ" وقال تعالیٰ "ھو الذی بعث فی الامیّینَ رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" وقال تعالیٰ "واذکرن مایتلیٰ علیکن فی بیوتکن من اٰیات اللہ والحکمۃ. والکتاب ھو القراٰن والحکمۃ ھی السنۃ باتفاق السلف وما اخبر الرسول عن اللہ فھو فی وجوب تصدیقه والایمان به کما اخبر به الرب تعالیٰ علی لسان رسوله ھذا اصل متفق علیه بین اھل الاسلام، لا ینکرہ الامن لیس منھم وقد قال النبی ﷺ انی اوتیت الکتاب ومثله معه۔ (ص ۹۲)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن اور حکمت ہیں (اس کے بعد علامہ نے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہی قرآنی آیات درج کی ہیں جو اوپر پیش کی جاچکی ہیں جن میں کتاب و حکمت کی تنزیل و تعلیم کا ذکر اور ان کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے ان آیات کو درج کرنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں) کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے، رسول نے اللہ سے پاکر جو خبر دی اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں یہ اہل اسلام کا بنیادی اور متفق علیہ مسئلہ ہے اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے خود نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی گئی (یعنی سنت)۔

اسوۂ رسول ﷺ

آنحضرت ﷺ نے قرآن پاک کی جو تشریح و تبیین فرمائی اور وہ حکمت جو آپ پر نازل کی گئی ہر مؤمن بالقرآن کیلئے ان دونوں کا واجب القبول ہونا آپ معلوم کر چکے، ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز جس کی پیروی ہر مؤمن پر قرآن نے لازمی قرار دی ہے، وہ ہے پوری اسلامی ومذہبی زندگی کا وہ نمونہ جو آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس میں جلوہ گر تھا۔ سورۂ احزاب میں ارشاد ہے:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللہَ کَثِیْرًا (احزاب ۳۳ : ۲۱)

تمہارے لئے بھی تھی سیکھنی چال رسول اللہ کی اس کے لئے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے زندگی کے ہر مرحلہ میں رسول خدا ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم ہم کو دیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف جنگ کی حالت میں اور پریشانی کے موقع پر آپ کے صبر و ضبط کی مثال سامنے رکھنے اور فقط اس کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہو، جیسا کہ اس آیت کے متعلق آج کل کے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، اسلئے کہ اس کی تو کوئی کمزور سے کمزور وجہ نہیں ہو سکتی کہ جنگ کے موقع پر تو آپ کا طرزِ عمل واجبُ الاتباع ہے مگر امن و صلح کے موقع پر آپ کا طرزِ عمل لازم الاتباع نہیں ہے، یا بابِ جہاد میں تو آپ کی ذات میں ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے مگر اقامتِ صلوٰۃ و ادائے حج کے باب میں آپ کی ذات میں ہمارے لئے کوئی قابلِ پیروی نمونہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ پر اس شخص کو جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتا ہو آنحضرت ﷺ کی پیروی کا حکم بالکل عموم و اطلاق کے ساتھ دیا گیا، ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳: ۳۱)	کہئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے پیچھے چلو، اللہ تم سے محبت کریگا۔

یہاں اللہ کی محبت کا معیار مطلقاً نبی کا اتباع قرار دیا گیا، اگر رسول کی ذات اسوۂ عمل نہیں ہے اور قرآن کے ماننے والے اس کی پیروی کے مامور نہیں ہیں تو بتلایا جائے کہ اللہ نے اپنے نبی سے اپنی پیروی کرانے کو کیوں کہا؟

یہ کہنا تو عقل و فہم کی رسوائی کے سوا کچھ نہیں کہ "میری پیروی کرو" کا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں جو قرآن سناتا ہوں بس اُسکو سن لو، اسلئے کہ اتباع یا پیروی یا پیچھے چلنے کا یہ مطلب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوتا، ان الفاظ کے معنی تو کسی کے طرزِ عمل کی تقلید اور کسی کے طور طریقہ پر کاربند ہونے ہی کے آتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ہر حق طلب اور حق پسند کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہوگی کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو مجرد قرآن کے ماننے اور اپنے اپنے طور پر اس کو سمجھنے اور اپنے اپنے فہم کے مطابق اس پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ قرآن کے ساتھ حکمت کو بھی ماننے اور قبول کرنے اور اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو اسوۂ عمل قرار دینے کے بھی وہ مامور ہیں نیز قرآن پاک کو رسول سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ انہیں کی تعلیم، تبیین اور تشریح کی روشنی میں سمجھنے کے وہ مکلّف ہیں۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن پاک کی جو تبیین[۱] فرمائی اور تعلیم دی اور وہ حکمت[۲] جو آپ پر اُتاری گئی، نیز آپ کی پوری[۳] زندگی جس کا مکمل نقشہ ان خوش قسمتوں نے ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے جنہوں نے اس زندگی کا مشاہدہ کیا تھا انہیں تینوں چیزوں کا نام حدیث و سنت ہے۔ اور نُصوصِ کتاب اللہ کی رُو سے ان تینوں کے واجب القبول ہونے کا مطلب بالفاظِ دیگر یہ ہے کہ قرآن، حدیث و سنت کو واجبُ القبول اور واجبُ الاتباع قرار دیتا ہے۔

حدیث کے حجت ہونے کی ایک اور قرآنی دلیل

حدیث حُجت ہے یا نہیں؟ اور اس کو کوئی مسلمان نظر انداز کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ بھی خود قرآن پاک کا بتایا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے اتباع سبیل المؤمنین (مؤمنین اولین کے طریقہ پر چلنے) کو ضروری بتایا ہے، ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵

اور جو کوئی خلاف کرے رسول کی بعد اس کے کہ واضح ہو گئی اُس کے لئے ہدایت اور راہ پکڑے مؤمنین کے راستہ سے الگ ہم حوالہ کریں گے اس کو اس راہ کے جس کی طرف اُس نے رخ کیا ہے اور انجام کار ہم اُس کو داخل کریں گے دوزخ میں اور بُرا ہے وہ ٹھکانا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مؤمنین کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کو سخت وعید سُنائی ہے اور اس کو مستحق دوزخ قرار دیا ہے، پس ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں بھی یہ معلوم کیا جائے کہ مؤمنین اولین کا راستہ کیا تھا؟ وہ آنحضرت کے اقوال وافعال کو یا بلفظِ دیگر حدیث و سنت کو حجت مانتے اور اس کو مشعلِ راہ قرار دیتے تھے یا نہیں؟..... پس جب ہم اس باب میں مؤمنین اولین کی راہ و روش معلوم کرنے کے لئے اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم کو حسبِ ذیل حالات و واقعات ملتے ہیں۔

(۱) تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۹ میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی قضیہ آتا تھا تو پہلے وہ کتابُ اللہ میں نظر فرماتے تھے اگر کتابُ اللہ میں ان کو فیصلہ مل جاتا تو وہی فیصلہ صادر فرماتے، اس میں ناکامی کی صورت میں اگر رسولُ اللہ کی کوئی سنت اس باب میں انہیں معلوم ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر خود ان کو اس باب میں کسی سنت کا علم حاصل نہ ہوتا تو باہر نکل کر دوسرے مسلمانوں (صحابہ) سے دریافت فرماتے کہ ایک اس طرح کا معاملہ میرے پاس آیا ہے اگر تم کو معلوم ہو کہ آنحضرت نے اس قسم کے معاملہ میں کیا فیصلہ کیا ہے تو بتاؤ، پھر ایسا ہوتا تھا کہ بعض اوقات کئی کئی آدمی اکٹھا ہو کر بتاتے تھے کہ ہاں اس صورت میں آنحضرت نے یہ فیصلہ کیا تھا، اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ جَعَلَ فِيْنَا مَنْ يَّحْفَظُ عَنْ نَبِيِّنَا

خدا کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ بنائے جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں

(۲) آنحضرت کی وفات کے بعد سب سے پہلا اور سب سے مشکل مسئلہ یہ سامنے آیا کہ آپ کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے تو اس مسئلہ کا حل بھی صحابہؓ نے آنحضرت کی سنت میں تلاش کیا۔

طبقات ابنِ سعد و تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت علی کا قول منقول ہے کہ آنحضرت کی وفات

کے بعد ہم نے اپنے معاملہ (مسئلہ جانشینی) میں غور و فکر کیا تو ہم نے یہ پایا کہ آنحضرت نے ابو بکر صدیق ؓ کو اپنی زندگی میں نماز کیلئے آگے بڑھایا (یعنی امام مقرر کیا) تو جسکو آپ نے ہمارے دین کیلئے پسند کیا تھا ہم نے اس کو اپنی دنیا کیلئے بھی پسند کر لیا اور ابو بکر کو آگے بڑھایا (جانشینِ رسول منتخب کر لیا)۔

تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت ابن مسعودؓ کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت کی وفات کے بعد انصار کی زبانوں پر یہ بات آئی کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم (مہاجرین) میں سے ہو، یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے انصار کے پاس جا کر کہا اے گروہِ انصار! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آنحضرت نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا کہ وہ لوگوں کی امامت کریں، اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ کس کا دل گوارا کرتا ہے کہ ابو بکرؓ سے آگے بڑھے، یہ سنتے ہی انصار کی آنکھیں کھل گئیں اور بول اُٹھے

نَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ نَتَقَدَّمَ اَبَا بَكْرٍ خدا کی پناہ ہم ابو بکرؓ کے آگے بڑھیں

یعنی سنت نبی سامنے آجانے کے بعد تمام انصار مطمئن ہو گئے اور بے چوں و چرا اس کو تسلیم کر لیا۔

نیز اسی کتاب میں ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد انصار کے مجمع میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت سعدؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سعد! تم جانتے ہو، تم بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت نے ایک بار فرمایا تھا قُرَيْشٌ وُلَاةُ هٰذَا الْاَمْرِ (اس امر کے والی قریش ہیں) حضرت سعدؓ بے تامل بولے کہ آپ نے سچ کہا، ہم وزیر و پُشت پناہ ہوں گے اور آپ لوگ امیر و والی (یعنی آنحضرتؐ کا قول یاد دلانے کے بعد ان حضرات نے خلافت کا خیال چھوڑ دیا۔)

وفاتِ نبوی کے بعد دوسرا مرحلہ آپ کے دفن کا تھا، اس میں اختلاف رائے تھا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے، اس کا فیصلہ بھی حدیثِ نبوی سے ہوا۔

اسی کتاب اور دوسری بہت سے کُتب (مثلاً تاریخ کامل ص ۲۲۵ ج ۳) میں ہے کہ جب یہ اختلاف رائے ہوا تو حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہر نبی اپنی اسی خواب گاہ کے نیچے مدفون ہوتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو"۔ یہ سنتے ہی سارا اختلاف ختم ہو گیا، اور باتفاق رائے آنحضرت اسی مقدس سرزمین میں جہاں آپ کی روحِ پاک قبض کی گئی تھی سپردِ خاک کئے گئے۔

تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ جمع قرآن کا واقعہ ہے، حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو جب یہ مشورہ دیا کہ پورا قرآن یکجا کر دیا جائے اور ابتداء سے انتہا تک یکجا لکھ کر ایک مصحف میں دو لوحوں کے درمیان محفوظ کر دیا جائے تو حضرت ابو بکرؓ ابتداءً بار بار یہی فرماتے تھے کہ:

كَيْفَ اَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللهِ میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ نے نہیں کیا

پھر حضرت ابو بکر کو شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر جمع قرآن کی اہم خدمت ان کے سپرد کرنا چاہی تو ابتداء میں اُن کو بھی تامل ہوا اور وہ بھی بار بار یہی کہتے تھے **كَيْفَ تَفْعَلَانِ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ**..... لیکن بعد میں اللہ نے ان کے سینہ کو بھی کھول دیا اور

شیخین کی رائے کا حق ہونا ظاہر کر دیا تو وہ اس خدمت کی انجام دہی پر کمر بستہ ہوگئے۔

اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ مقصد ہے کہ اس سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ہر کام پر اقدام کرنے سے پہلے آنحضرت کی سنت کی تلاش و جستجو ہوتی تھی یہی ان کی روش اور ان کا راستہ تھا۔

مؤطا امام مالک میں ہے کہ ایک آدمی کی وفات کے بعد اس کی دادی حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں اپنی میراث طلب کرنے آئی آپؓ نے فرمایا:

مالكِ في كتاب الله شئ وما علمت لكِ في سنة رسول الله شيئاً فارجعي حتى اسأل الناس۔

کتاب اللہ میں تیرا کچھ حق نہیں ہے اور آنحضرت کی سنت میں تیرا کوئی حق مجھے معلوم نہیں، لہٰذا اس وقت لوٹ جا، تا آنکہ میں اور لوگوں سے دریافت کروں۔

اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہؓ نے بتایا کہ میری موجودگی میں آنحضرت نے میت کی دادی کو سُدس (چھٹا حصّہ) دلوایا تھا حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ تو حضرت محمد بن مسلمہؓ انصاری نے بھی کھڑے ہو کر وہی بیان کیا، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو سُدس دلوایا۔

پارسیوں کا ملک اسلامی مقبوضات میں داخل ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر لاحق تھی کہ پارسیوں سے جزیہ لیا جائے یا نہیں (اس لئے کہ قرآن پاک میں صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے اور قرآن کی زبان میں اہلِ کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہوتے ہیں) تا آنکہ عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے، تب حضرت عمرؓ نے پارسیوں سے جزیہ لیا۔

صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کی وفات کے صرف چالیس دن بعد بچہ جنا تو اس کی عدت پوری ہوگئی یا نہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ وضع حمل اور چار ماہ دس دن پورے ہونے میں سے جو بعد میں واقع ہوگا اس سے عدت منقضی ہوگی، اس مجلس میں ابو سلمہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی موجود تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر ابو سلمہؓ نے کہا (قرآن میں ہے):

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ

حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے

ابو سلمہؓ کا مطلب یہ تھا کہ صورتِ مسئولہ میں عدّت پوری ہوگئی یہ سن کر حضرت ابو ہریرہؓ بولے کہ میں بھی اپنے بھتیجے ابو سلمہؓ سے اتفاق کرتا ہوں، تب حضرت ابن عباسؓ نے اپنے غلام کریب کو حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا (انہوں نے سوال سن کر) فرمایا سبیعہ اسلمیہ حاملہ تھیں کہ اسی حالت میں ان کے شوہر شہید کر دیئے گئے واقعہ شہادت کے چالیس دن بعد سبیعہ کے بچہ پیدا ہوا اور نکاح کے پیغام آنے لگے تو

آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح کرادیا۔

حافظ ابن حجرؒ اس واقعہ کے تحت میں فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اپنے قول سے رجوع کرلیا اور اسکی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن عباسؓ کے شاگرد اور تبعین کا قول جماعت کے موافق ہے۔

اس واقعہ سے اختلاف رائے اور دو آیتوں میں بظاہر تعارض کے وقت صحابہؓ کا سنت کی طرف رجوع کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۸) ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں ہے کہ رومی سلطنت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ایک خاص مدت تک جنگ بندی تھی، جب وہ مدت قریب ختم ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن کے ملک کی طرف کوچ کرنا شروع کردیا، ان کا خیال تھا کہ مدت کے اندر جنگ تو شروع نہ کریں گے لیکن ان کے قریب پہنچ جائیں اور جب مدت ختم ہو جائے گی تو اچانک یکبارگی دھاوا بول دیں گے ایک دن حضرت معاویہؓ کو دور سے ایک سوار آتا دکھائی دیا، جو بلند آواز سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا اللہ اکبر، اللہ اکبر عہد کو پورا کرنا ہے، توڑنا نہیں ہے، لوگوں نے بغور دیکھا تو وہ سوار حضرت عمرو بن عبسہؓ صحابی تھے، حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رسول خدا ﷺ سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کا کسی قوم سے کوئی معاہدہ ہو تو اس عہد میں کوئی ردوبدل نہ کرے، جب تک کہ اس کی مدت نہ گذر جائے، یا اس قوم کو مطلع نہ کردے، حضرت معاویہؓ یہ سن کر اپنی فوج کے ساتھ دارالاسلام کو واپس ہوگئے۔

۹) تاریخ طبری و تاریخ کامل (ص ۲۹۳ ج ۲) میں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک بار مدینہ سے بارادہ شام روانہ ہوئے جب مقامِ سرغ میں پہنچے تو امرائے لشکر نے آکر خبر دی کہ ملک شام میں اس وقت وباء پھوٹ پڑی ہے، طاعون بڑے زوروں کا پھیلا ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر پہلے مہاجرین وانصار کو جو ساتھ میں تھے اکٹھا کر کے مشورہ کیا تو وہ مختلف الرائے ظاہر ہوئے، کچھ لوگوں نے کہا لوٹ چلیے اور کچھ نے کہا جب لوجہ اللہ آئے ہیں تو لوٹیں کیوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اختلاف دیکھ کر ان لوگوں سے اٹھ جانے کو کہا اور فرمایا اب قریشی مہاجرین فتح کو بلاؤ، وہ آئے تو سب کے سب لوٹ جانے کے حق میں تھے، اس بنا پر حضرت عمرؓ نے واپسی کا قصد کیا، مگر حضرت ابو عبیدہؓ نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگ اسی حیص بیص میں تھے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف آپہنچے، وہ پہلے مشورہ میں شریک نہ ہو سکے تھے اور ان کو کچھ معلوم نہ تھا، اس لئے انہوں نے پوچھا کیا قصہ ہے، جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا میرے پاس اس باب میں ایک علم ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ صاحبِ امانت اور قابلِ تصدیق ہیں، بتایئے وہ کیا علم ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے سُنا ہے کہ:

جب تم سنو کہ کسی سرزمین میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو وہاں جاؤ مت اور جب تمہارے جائے قیام میں وبا پھیل جائے تو بقصدِ فرار اس جگہ سے نکلو مت یہ سنتے ہی سب اختلاف مٹ گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب کو لے کر مدینہ لوٹ آئے۔

تاریخ کامل و تاریخ خلفاء وغیرہ تمام کُتبِ تاریخ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور تمام صحابہؓ نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کرنے کے بعد بایں الفاظ بیعت کی تھی:

نبایعك علی کتاب اللہ وسنة رسوله وسنة الخلیفتین بعدهٗ

ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت اس شرط پر کرتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، رسول کی سنت اور دونوں سابق خلفاء کی روش پر عمل کریں گے۔

یہ دس مثالیں بلامبالغہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں، اس سے زیادہ کی ہم اسلئے ضرورت نہیں سمجھتے کہ ایک مُنصف مزاج کیلئے یہی کافی سے زیادہ ہیں اور انکو سامنے رکھنے کے بعد کوئی بھی مُنصف اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ مؤمنین اولین کا راستہ حدیث و سنت کے ساتھ احتجاج اور ہر باب میں اُس کو مشعلِ راہ قرار دینا تھا۔

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اوپر [illegible] کے بیان کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا اس کا ماخذ حدیث و تاریخ کی کتابیں ہیں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم کے بعد لکھی گئی ہیں اور وہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو گزارش ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ قرآن پاک نیز اسکے احکام اور اس پر ایمان و عمل کا حکم باقی ہو اور [illegible] کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ اور اسکی کوئی صورت موجود نہ ہو، ایسا کہنا تو قرآن کو نا قابلِ عمل اور معطل قرار دینا ہے جس کی جرأت کوئی مؤمن تو مؤمن کوئی صاحبِ علم و انصاف غیر مؤمن بھی نہیں کر سکتا، قرآن پاک پر عمل کا دروازہ جب تک کھلا رہے گا اس وقت تک یہ راستہ بھی کھلا رہے گا اور اس راستہ کے پورے معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی موجود رہیں گے اور جب ایسا ہے تو بتایا جائے کہ بجز مجامع احادیث و کتبِ طبقات و اسماء الرجال اور کُتبِ سِیَر و تاریخ کے اور کون سا ذریعہ ہے جس سے مؤمنین اولین کی راہ و روش کا تفصیلی علم حاصل ہو سکے، اگر کوئی دوسرا ذریعہ بھی ہے تو بتایا جائے، اور اگر نہیں ہے تو مذکورہ بالا چیزوں کو بالکلیہ جعلی، بے بنیاد اور بے اعتبار کہنا در حقیقت قرآن پاک پر عمل کا دروازہ بند کرنا ہے، اس کے علاوہ اسلام اور مسلم قوم کو دوسرے مذاہب و اقوام عالم پر جو مخصوص تفوق و امتیاز حاصل ہے اسکو بھی برباد کرنا ہے اسلئے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مسلم قوم کی نہ کوئی تاریخ ہے، نہ اسکے علمی و عملی کارنامے ہیں اور نہ ان کارناموں کا کوئی ذریعۂ علم دنیا میں موجود ہے، کیا ایسی بات کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں بعض منکرین حدیث کا یہ رویّہ کس قدر عجیب و غریب اور کیسا نا قابل فہم ہے کہ وہ تاریخ پر تو اعتماد کرتے ہیں اور روایاتِ حدیث کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے حالانکہ کتبِ تاریخ کے تمام مصنفوں نے ہر ہر واقعہ کی نسبت نہ تو یہ بتانے کا التزام کیا ہے کہ وہ ان کو کس واسطہ اور کس سلسلہ سے معلوم ہوا، نہ ان واسطوں کی عدالت و ثقاہت وغیرہ اُن شرائط کی سختی سے پابندی کی ہے جن کی محدثین نے کی ہے، بایں ہمہ تاریخ تو قابل قبول اور لائق اعتماد ہو لیکن مجامع احادیث جن میں ہر ہر قول و فعلِ رسول یا آثار و احوال صحابہ کے لئے پورا پورا التزام ہے کہ مصنف کو جن واسطوں سے علم ہوا کہ ان کو سلسلہ وار اس طرح بتائے کہ کہیں انقطاع نہ ہو اور یہ واسطے بھی ایسے ہوں کہ ان کے معتبر، عادل اور ثقہ ہونے کا ثبوت موجود ہو غرض

اس التزام و احتیاط کے باوجود حدیث کے مجموعے قابلِ اعتبار نہ ہوں، یہ کتنی عجیب اور کیسی ستم ظریفی ہے۔

علاوہ ازیں پختہ اور کھری سندوں کے ساتھ بھی حدیثوں کے نہ ماننے اور ان کو بے اعتبار کہنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہے کہ کتبِ احادیث کے مصنفوں نے محض بے بنیاد باتوں کو بالکل جعلی اور فرضی سندوں کے ساتھ کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

ان حضرات کو خالص علمی طور پر بھی تو سوچنا چاہئے کہ ایسا ممکن کیونکر ہے؟ کیا جب احادیث کے یہ مجموعے لکھے گئے اُس وقت دنیا میں ایک بھی صحیح قسم کا مسلمان نہیں تھا جو اس ساری جعل سازی اور افترا پردازی کا مقابلہ کرتا؟ یا کم از کم اُس پر نکیر ہی کرتا۔

مثال کے طور پر میں مؤطا کا نام لیتا ہوں، حدیث کا یہ مجموعہ بقول ابو طالب مکی ۱۲۰ھ یا ۱۳۰ھ کے بعد یعنی رسول خدا ﷺ کی وفات کے ایک سو دس[(۱۱۰)] یا ایک سو بیس[(۱۲۰)] برس بعد وجود میں آیا (مقدمہ تنویر الحوالک ص ۶) اور اس کے وجود میں آنے سے چند برس (تقریباً ۱۳ یا ۲۳ برس) پہلے تک آنحضرت ﷺ کے دیدار و گفتار سے شرف اندوز ہونے والے اصحابِ رسول اُس دنیا میں موجود تھے، اور ان لوگوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں جنھوں نے صحابۂ رسول ﷺ کی صُحبت کی سعادت پائی تھی اور بلادِ اسلام مثلاً بلادِ حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ کا ذکر اس وقت چھوڑیئے صرف مدینہ منورہ ہی کو لیجئے جہاں یہ کتاب وجود میں آئی اُسی میں اتنی کثرت سے تابعین (جنھوں نے صحابہ کی صحبت پائی تھی) موجود تھے جن کا شمار مشکل ہے، مثال کے طور پر چند نام سنئے:

(۱) اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ المتوفی ۱۳۶ھ
(۲) اسماعیل بن محمد بن زہری المتوفی ۱۳۴ھ
(۳) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن المتوفی ۱۳۹ھ
(۴) زید بن اسلم المتوفی ۱۳۶ھ
(۵) سالم بن ابی امیہ المتوفی ۱۲۹ھ
(۶) سعد بن اسحاق المتوفی بعد ۱۴۰ھ
(۷) سعید بن ابی سعید المقبری المتوفی ۱۲۳ھ
(۸) سلمہ بن دینار المتوفی بعد ۱۴۰ھ
(۹) شریک بن عبداللہ بن ابی نمر المتوفی بعد ۱۴۰ھ
(۱۰) صالح بن کیسان المتوفی بعد ۱۴۰ھ
(۱۱) صفوان بن سلیم المتوفی ۱۲۴ھ
(۱۲) عبداللہ بن ابی بکر بن ابی حزم المتوفی ۱۳۵ھ
(۱۳) عبداللہ بن دینار المتوفی ۱۲۷ھ
(۱۴) ابوالزناد المتوفی ۱۳۰ھ
(۱۵) عبدر بن سعید المتوفی ۱۳۹ھ
(۱۶) محمد بن المنکدر المتوفی ۱۳۱ھ
(۱۷) مخرمہ بن سلیمان المتوفی ۱۳۰ھ
(۱۸) موسیٰ بن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ
(۱۹) وہب بن کیسان المتوفی ۱۲۷ھ
(۲۰) یحییٰ بن سعید قاضی مدینہ المتوفی ۱۴۳ھ
(۲۱) یزید بن رومان المتوفی ۱۳۰ھ
(۲۲) یزید بن عبداللہ بن لیثی المتوفی ۱۳۹ھ
(۲۳) ہشام بن عروہ المتوفی ۱۴۵ھ
(۲۴) مسور بن رفاعہ المتوفی ۱۳۸ھ
(۲۵) ابو طوالہ قاضی مدینہ المتوفی آخر ایام بنی امیہ (و آخر ایام بنی امیہ ۱۳۲ھ)

علمی سلسلہ کے علاوہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے بھی تابعین کی حیثیت آنحضرت ﷺ کی نسبت سے وہی

تھی جو نسبی سلسلہ میں پوتوں کی حیثیت دادا کی نسبت سے ہوتی ہے، اس لئے اگر سلسلۂ اخذ و تعلیم نہ ہوتا تب بھی جس طرح دادا کے حالات اور کارنامے پوتوں کو اپنے گھروں میں معلوم ہو جاتے ہیں اسی طرح اس عہد کے لوگوں کو باقاعدہ تعلیم کے بدون ہی آنحضرت کے بکثرت حالات اور کارناموں کا علم حاصل ہونا ایک بدیہی بات ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایسے عہد اور ایسی حالت میں اور ایسے لوگوں کی موجودگی میں پھر ایسی جگہ پر جہاں آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری دس سال گذرے ہیں اور وہاں کا کوئی گھر اور کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کو آنحضرت ﷺ سے وابستگی اور آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو، اس سرزمین میں ایک شخص (امام مالکؒ) آپ کی حدیثوں اور سنتوں کے بیان میں ایک مجموعہ تیار کر کے اسی سرزمین میں اس کو علی الاعلان سناتا ہے اور ہزاروں آدمی تمام بلادِ اسلامیہ سے رختِ سفر باندھ کر مدینہ آتے اور اس مجموعہ کو سن کر اور بہت سے لوگ اس کی نقلیں لے کر اپنے اپنے وطن واپس جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ان کا ہر آدمی اس کو سیکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں میں پھیلاتا ہے مگر مدینہ مقدسہ یا کسی جگہ کا ایک متنفس بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ساری حدیثیں یا ان میں سے بہت سی جعلی ہیں...... کوئی صاحب عقل بتائے کہ اولاً ایسی حالت میں امام مالکؒ کو اگر (معاذ اللہ وہ مفتری ہوتے) اس کی ہمت ہی کیسے ہوتی اور اگر بالفرض ہوتی بھی تو سارے اہل مدینہ اس [illegible] اور دین میں جعلی چیز کے اضافہ اور اس کی اشاعت کا خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہ جاتے!

ما لکم کیف تحکمون

مزید براں یہ کہ اس مجموعہ میں امام مالکؒ مذکورہ بالا پچیس اشخاص اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے باشندگانِ مدینہ کا نام لے کر فرماتے ہیں کہ انہیں لوگوں نے ہم سے یہ حدیثیں اور سنتیں بیان کی ہیں اگر بالفرض امام مالکؒ نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو ناممکن ہے کہ جو لوگ اس وقت زندہ تھے اُن کی تکذیب نہ کرتے۔

حاصل کلام یہ کہ موطا یا دوسرے مجامیع حدیث اور ان کی اسنادوں کا بالکل بے سر وپا کہنا صرف ضلالت ہی نہیں بلکہ قابل عبرت جہالت و حماقت بھی ہے۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہ من نور۔

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے پہلے کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی، بلکہ اس کے برخلاف ان مجموعوں کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک ہر دور میں اصولی طور پر ان کو صحیح و ثابت اور واقعی چیز تسلیم کیا گیا اور ہر دور میں ان مجموعوں کو سیکڑوں ہزاروں اہل علم نے اپنے بڑوں سے سنا اور روایت کیا، خود امام مالکؒ سے موطا کو تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے سنا جیسا کہ شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے بستان المحدثین ص۹ میں تحریر فرمایا ہے۔ اور سیوطی نے تنویر الحوالک کے مقدمہ میں تقریباً پچاس ایسے آدمیوں کا نام بنام ذکر کیا ہے جنہوں نے امام مالکؒ سے موطا کو سن کر روایت کیا ہے، پھر ان لوگوں سے آج تک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تواتر کے ساتھ اس کی روایت ہوتی آئی ہے۔

پھر حیرت ہے کہ یہ منکرینِ حدیث اس دیدہ دلیری سے حدیث کا انکار کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے اور کیوں اس پر غور نہیں کرتے کہ اپنے بزرگوں اور اکابر کے آثار کی حفاظت اور ان کے کارناموں کو زندہ اور

ان کے سوانح کو یاد رکھنے کا جذبہ فطری طور پر ہر قوم میں ہوتا ہے اور دنیا میں ہر زندہ قوم اپنے بزرگوں کے آثار، بہادروں کے کارناموں اور شاعروں کے کلام کو باقی اور محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلم قوم جو دنیا کی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ علم دوست اور سب سے زیادہ محاسنِ کمالات اور زرین خصوصیات کی حامل ہے، اس نے اور تو اور خود اپنے پیغمبر و رسول ہی کی روایات انکے سیر و مغازی اور ان کے اخلاق و عادات کو نہ محفوظ رکھا ہو نہ دوسروں تک پہنچایا ہو، دنیا میں کون صاحبِ عقل ایسا کہہ سکتا ہے اور کون اس کو باور کر سکتا ہے؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات و مطالب
بھی روایات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا

پھر اس بات پر بھی دھیان دینا چاہئے کہ اگر قرآن پاک کے علاوہ اور کوئی مستند ذریعہ معلومات نہ ہو اور احادیث و آثار کی روایات کو قابل اعتبار نہ سمجھا جائے تو خود قرآن پاک کی بہت سی آیات کا مفہوم و مطلب مُبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا مثلاً قرآن پاک میں ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا (احزاب ۳۳: ۳۷)

پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی

کیا روایات کو یکسر نظر انداز کر دینے کے بعد قرآن مجید کے صرف ان الفاظ سے اُس واقعہ کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور کیا صرف قرآن سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ زید کون تھے اور اُن کی بی بی کون تھیں اور قصہ کیا پیش آیا تھا۔ یا مثلاً ارشاد ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ـ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ـ (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس پر کہ آیا اسکے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنور تا اور پاک صاف ہوتا۔

بتایا جائے کیا صرف قرآن سے یہ پتہ چلایا جاسکتا ہے کہ یہ آنے والے الاعمٰی کون تھے، اور وہ کون لوگ تھے جن کی طرف آنحضرت ﷺ اُن کے آنے کے وقت متوجہ تھے؟

اسی طرح غزوۂ احزاب و حنین وغیرہ کے جن واقعات کا ذکر قرآن پاک میں ہے بتایئے کہ روایات کے سارے ذخیرہ کو نا معتبر قرار دے کر ان واقعات کی ضروری تفصیل بھی کہاں سے معلوم کی جائے یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (انفال ۸: ۷)

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے قبضہ میں آئیگی۔

کیا کوئی صرف قرآن سے یہ بتلا سکتا ہے کہ یہ دو جماعتیں کون تھیں؟ اور اللہ جس وعدہ کو یہاں یاد دلا رہا ہے وہ وعدہ قرآن میں کہاں ہے؟ اگر قرآن میں نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی دوسری قسم کی وحی بھی

آنحضرت پر آتی تھی۔

یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۔　　(انفال ۸: ۴۲)

جس وقت تم تھے ورے کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اُتر گیا تم سے

کوئی مدعی صرف قرآن سے بتائے کہ یہ کہاں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور کس جگہ کے قریب و دور کے ناکے مراد ہیں؟ اور کس قافلہ کا نیچے اُترنا بیان ہوا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۔　　(توبہ ۹: ۲۵)

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت سے میدانوں میں

کیا روایات کا انکار کرنے کے بعد ان بہت سے میدانوں کی تفصیل کہیں سے معلوم ہو سکتی ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْهُمَا فِي الْغَارِ اِذْيَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا　　(توبہ ۹: ۴۰)

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت نکالا اس کو کافروں نے دو جان سے، جب دونوں تھے غار میں، جب کہنے لگا اپنے رفیق کو نہ غم کھا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضرت　کہاں سے نکالے گئے، یہ دوسرا آپ کا رفیق کون تھا؟ اور کس غار میں آپ اپنے رفیق کے ساتھ روپوش تھے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا روایات کی طرف رجوع کے سوا کوئی دوسری صورت بھی ان باتوں کو معلوم کرنے کی ہے؟

علیٰ ہذا القیاس قرآن پاک میں ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا۔　　(توبہ ۹: ۱۰۸)

جس مسجد کی بنیاد دھری پرہیزگاری پر پہلے دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اُس میں اس میں وہ مرد ہیں جن کو چاہت ہے پاک رہنے کی۔

یہ کس مسجد کا ذکر ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جنکی اس آیت میں مدح ہو رہی ہے؟ اور اُنکی طہارت پسندی کا کیا خاص معیار تھا جس کو اس آیت میں سراہا گیا ہے؟ کیا ان باتوں کا جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۔　　(توبہ ۹: ۱۱۸)

اور اللہ کی مہربانی ہوئی ان تین شخصوں پر جن کے معاملہ کو ملتوی رکھا گیا تھا۔

یہ کون تین شخص ہیں اور ان کا کیا قصہ تھا۔ اور کیوں ان کا معاملہ ملتوی رکھا گیا؟ کیا روایات کے بغیر یہ باتیں حل ہو سکتی ہیں؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:

وَأَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۔ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۔

اور اُتار دیا اُنکو جو اُنکے رفیق ہوئے تھے اہل کتاب میں سے اُن کی گڑھیوں سے اور ڈالا اُنکے دلوں میں رُعب، کتنوں کو تم مارنے لگے اور کتنوں کو قید کیا، اور وارث کیا تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور انکے مالوں کا اور ایک زمین جس پر نہیں ڈالے تم نے قدم۔

یہ مظاہرین کون تھے؟ اور انکی زمین و جائداد کہاں تھی؟ نیز وہ دوسری زمین جہاں مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے مگر اسکے وارث بنائے گئے کون سی تھی، کیا روایات سے قطع نظر کر کے ان باتوں کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

یہ صرف چند مثالیں بلا قصدِ استیعاب بیان کی گئی ہیں اس طرح کی ابھی بہت سی مثالیں ذکر کی جا سکتی ہیں، مقصود یہ ہے کہ روایات کا انکار کر دینے کے بعد قرآن کی مذکورہ بالا آیات کا واضح اور متعین مفہوم سمجھنا اور سمجھانا قریباً ناممکن ہے۔

الغرض جو شخص قرآن پاک کو اللہ کی کتاب مانے اور اُس کا سمجھنا اور اُس پر عمل کرنا ہر زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ضروری سمجھے، اُس کو احادیث و سیر کے اُس ذخیرہ کو بھی ماننا پڑے گا جس کو پوری طرح جانچ پرکھ کے ائمہ محدثین و اہلِ سیر نے محفوظ کیا ہے، اور جس کے بہت بڑے حصے کی حیثیت یقیناً قرآن کے ضروری توضیحی ضمیمہ کی ہے۔

حدیث و سنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل

یہاں پہنچ کر حدیث و سنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل ذہن میں آ گئی اُس کو بھی یہیں عرض کرتا ہوں۔

جو حضرات واقعۃً کسی علمی مغالطہ ہی کی وجہ سے یہ بات کہتے ہیں کہ دینی حجت بس قرآن ہی ہے اور قرآن کے سوا کسی اور ذریعہ سے شریعت کا کوئی حکم اور کوئی دینی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا اور رسول کا کام بس قرآن پہنچانا ہی تھا، وہ اگر ایک طالبِ حق اور جویائے ہدایت کی طرح قرآن مجید ہی کو غور سے دیکھیں تو اس میں اُن کو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ بطور حکایت اور واقعہ کے یا کسی اور سلسلہ میں کسی دینی عمل کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل زمانۂ نزولِ قرآن میں ایک دینی عمل کی حیثیت سے ہوتا تھا حالانکہ قرآن مجید میں کہیں اُس عمل کا حکم نہیں دیا گیا، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم ان کو سنت کے ذریعہ دیا گیا تھا...... یہاں اس کی صرف دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قرآن میں حکم ثابت بالسنۃ کے ذکر کی چند مثالیں

سورۂ توبہ میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے جنازوں کی نماز پڑھنے سے ان لفظوں میں منع فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا۔ (التوبہ ۹: ۸۴)

اُن میں سے جو کوئی مرے آپ کبھی اُس کے جنازے کی نماز نہ پڑھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نمازِ جنازہ شروع ہو چکی تھی اور رسول اللہ ﷺ اموات کے جنازوں پر نماز پڑھا کرتے تھے، حالانکہ قرآن میں اس سے پہلے نازل ہونے والی کوئی آیت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو جنازہ کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو اس لئے ماننا پڑے گا کہ نمازِ جنازہ کا حکم سنت کے ذریعہ دیا گیا تھا۔

اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا (جمعہ ۶۲: ۱۱) میں ایک حکایت اور شکایت کے ضمن میں جمعہ کے خطبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور قطع نظر اس سے ہمارا خیال ہے کہ حدیث و سنت کے جو منکرین ہمارے مخاطب ہیں وہ غالباً اس کا انکار نہ کر سکیں گے کہ خطبۂ جمعہ ایک شرعی حکم اور دینی عمل ہے جو رسول اللہ ﷺ خود دیا کرتے تھے اور اُمت میں اب تک اسی طرح متوارث ہے..... لیکن کوئی قرآنی آیت نہیں بتلائی جا سکتی جس میں اس خطبہ کا حکم دیا گیا ہو، پس لازماً یہی ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

علیٰ ہٰذا اپنے کو مسلمان کہنے والا کوئی آدمی بھی اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ نماز سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے یہ ایک دینی عمل ہے اور عہدِ نبوت سے لے کر اب تک متوارث ہے اور قرآن مجید میں بھی واقعہ کی حکایت کے طور پر ایک جگہ اس اذان کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً سورۂ مائدہ میں عقل کے دشمن کافروں کی اس جہالت اور شرارت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ "اذان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور اسکی نقل کر کے منہ چڑاتے ہیں" وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ (مائدہ ۵: ۵۸) اسی طرح سورۂ جمعہ میں ایک دوسرے حکم کے بیان کے سلسلہ میں جمعہ کی اذان کا ضمنی ذکر آیا ہے (إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ جمعہ ۶۲: ۹) بہر حال ان آیات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عہد نبوی میں ان آیات کے نازل ہونے سے بھی پہلے سے اذان ایک دینی عمل کی حیثیت سے مروج تھی، اور قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں بتائی جا سکتی جس کے ذریعہ اذان کا حکم دیا گیا ہو اس لئے ماننا پڑے گا کہ اذان کا حکم قرآن کے ذریعے نہیں بلکہ سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

اس کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس مقدمہ کے محدود صفحات میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

حدیث و سنت کے حجتِ دینی اور واجب الاتباع ہونے پر یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اگرچہ الحمد للہ ایک طالبِ حق خدا ترس کے لیے وہ بھی بالکل کافی ہے لیکن آخر میں ایک اصولی بات عرض کر کے سلسلۂ کلام ختم کیا جاتا ہے۔

رسول ﷺ کا صحیح مقام

ہمارے خیال میں حدیث و سنت کے منکرین کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رسول کی اصل حیثیت اور اُس کے صحیح مقام کو نہیں سمجھا ہے، اگر وہ مقامِ نبوت کو سمجھنے اور نبی و رسول کی معرفت حاصل کرنے کے لئے صرف قرآن ہی میں تدبّر کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور پیام رساں ہی کی نہیں ہے، بلکہ آپ مطاع، متبوع، امام، ہادی، قاضی، حاکم، حَکَم وغیرہ وغیرہ بھی ہیں اور قرآن ہی نے آپ کی ان حیثیتوں کو بھی بیان کیا ہے۔

(۱) رسول مطاع ہے اور اس کی اطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔

قرآن مجید میں جا بجا[1] اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ — اللہ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اطاعت کرو

اس حکم میں "اطیعوا الرسول" کو "اطیعوا اللہ" سے الگ مستقل جملہ کی شکل میں قرآن مجید میں جس طرح مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اُس سے ہر وہ شخص جس کو عربی زبان کا کچھ بھی ذوق ہو یہی سمجھے گا کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے، یعنی اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کتاب رسول لائے ہیں اُس کو مانا جائے اور اُس کے حکموں پر چلا جائے کیونکہ اگر صرف اتنی ہی بات کہنی ہوتی تو یہ تو "اطیعوا اللہ" میں کہی جاچکی تھی پھر امر اطاعت کے مستقل اعادہ کے ساتھ "اطیعوا الرسول" کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں خود قرآن مجید کی بعض دوسری آیات سے بھی یہ بات اور زیادہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔ سورۂ نساء کے پانچویں رکوع کے آخر میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد ان منافقین کی مذمّت کی گئی ہے جو اپنی غرض پرستی اور منافقت کی وجہ سے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں کوتاہی کرتے تھے اسی سلسلۂ بیان میں اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا
(نساء ۴ : ۶۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس کتاب کی طرف جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو اے رسول! تو دیکھے گا اُن منافقوں کو کہ اعراض اور رُوگردانی کرتے ہیں تیری طرف سے۔

اس آیت میں "ما انزل اللہ" یعنی کتاب اللہ کی طرف بلانے کے ساتھ "رسول" کی طرف بلانے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ اوپر کی آیتوں میں اطاعتِ رسول کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے اُس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت کرو بلکہ رسول کی اطاعت اُس سے الگ اور مستقل چیز ہے۔

---

[1] نساء ع ۸، مائدہ ع ۱۲، النور ع ۷، محمد ع ۴، تغابن ع ۲

اور اسی سورہ کے اسی رکوع میں دو ہی آیتوں کے بعد اللہ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ (نساء ۴: ۶۴)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس واسطے کہ اُسکے حکم پر چلا جائے اللہ کے فرمان سے۔

۲) رسول منجانب اللہ ہادی اور امام ہوتے ہیں، ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیاء ۲۱: ۷۳)

اور ہم نے بنایا اُن کو امام و پیشوا، وہ ہدایت و رہنمائی کرتے تھے ہمارے حکم سے

۳) رسول اللہ ﷺ منجانب اللہ حاکم و حکم بھی قرار دیئے گئے تھے اور ہر اختلاف و نزاع میں آپ کو حکم بنانا اور آپ کا فیصلہ دل و جان سے ماننا تمام اہل ایمان کے لئے فرض بلکہ شرط ایمان قرار دیا گیا تھا...... سورۂ نساء کی یہ آیت جو پہلے بھی ایک جگہ درج ہو چکی ہے) پھر پڑھئے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (نساء ۴: ۶۵)

اے پیغمبر! قسم تیرے پروردگار کی یہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حکم بنائیں تجھے اپنے نزاعی معاملات میں پھر (جب تو اپنا فیصلہ دیدے تو) کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے اور تسلیم کر لیں اُس کو پوری طرح مان کر۔

اسی طرح سورۂ احزاب کی آیت:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ (احزاب ۳۳: ۳۶)

اور کسی ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت کی یہ شان نہیں ہے کہ جب حکم دیدے اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا تو رہے اُن کا کچھ اختیار اپنے معاملہ میں۔

اور سورۂ نور کی آیت:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (نور ۲۴: ۵۱)

ایمان والوں کو جب بلایا جائے اللہ کی طرف اور اُسکے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ دیں اُن کے درمیان تو اُن کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں "سمعنا و اطعنا" (یعنی ہم نے سن لیا اور مان لیا)

الغرض یہ سب آیتیں اس باب میں نص صریح ہیں کہ مسلمانوں کے جس معاملہ میں رسول جو فیصلہ کریں وہ واجب التسلیم ہے اور کسی مسلمان کو اُس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۴) کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کے لئے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے اور جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی اور بدبختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی

بھی موجبِ ضلالت و شقاوت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۔ (احزاب ۳۳: ۷۱)

جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اُس نے بڑی مراد پائی

وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (احزاب ۳۳: ۳۶)

اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اُس کے رسول کی وہ بڑی کھلی گمراہی میں جا پڑا

نیز قرآن ہی میں بتایا گیا ہے کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح خدا کی نافرمانی کرنے پر کفِ افسوس ملیں گے اور اپنا ماتم کریں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

وَيَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۔ (احزاب ۳۳: ۶۶)

جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے اُن کے منہ آگ میں کہیں گے کاش! ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۔ (النساء ۴: ۴۲)

اُس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول کی نافرمانی کی کہ برابر کر دیئے جائیں زمین کے (یعنی خاک ہو کر زمین کا جزو بن جائیں اور عذاب سے بچ جائیں)

نیز مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ رسول کی نافرمانی کی کوئی بات کبھی آپس میں نہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ (مجادلہ ۵۸: ۸)

اے ایمان والو! جب تم چپکے چپکے آپس میں باتیں کرو تو گناہ اور ظلم و زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔

(۵) رسول اللہ ﷺ جو دیں اُس کو قبول کرنا اور جس چیز سے روکیں اُس سے رُک جانا واجب ہے

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (حشر ۵۹: ۷)

جو تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اُس سے رک جاؤ۔

اگر اس آیت کا تعلق صرف اموال سے بھی مانا جائے تب بھی ہمارے مدعا کے لئے مضر نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی اتنی بات تو آیت سے ثابت ہی ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ اپنی صوابدید سے جو تقسیم کریں وہ اہلِ ایمان کے لئے واجبُ التسلیم ہے اور کسی کو اُس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے

(۶) ایک مؤمن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اُس سے زیادہ اُس کی جان پر نبی کا حق ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ (احزاب ۳۳: ۶)

نبی زیادہ حقدار ہے مؤمنوں کا ان کی جانوں سے

حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے اس آیت پر جو دو سطریں لکھی ہیں ان کے نقل کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے:

"نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنی روا نہیں، اور نبی حکم کرے تو فرض ہے۔"

(۷) اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری اور شرط ایمان ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (التوبہ ۹: ۶۲)

اور اللہ کو اور اس کے رسول کو راضی کرنا ان کیلئے بہت زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(۸) اللہ کی طرف اس کے رسول کو بھی دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین اور اللہ کی ہدایت سے محروم رہنے والے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ ۹: ۲۴)

اے پیغمبر! کہو (مسلمانوں کو) اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارا کمایا ہوا مال اور تمہاری تجارت جس کے بند ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے رہنے کے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ ساری چیزیں) تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جد و جہد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ کرے اللہ اپنا فیصلہ اور (یاد رکھو کہ) اللہ ہدایت نہیں دیتا فاسق لوگوں کو۔

(۹) اللہ کے رسول جب کسی کام کے لئے دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر مؤمن پر فرض ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ (الانفال ۸: ۲۴)

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اُسکے رسول کا جب بلاوے تم کو اُس کام کیطرف جس میں تمہاری حیات ہو۔

(۱۰) رسول اللہ ﷺ جب کسی کام کے لئے لوگوں کو بلائیں تو بلا اجازت اُٹھ کر چلا جانا کسی مؤمن کے لئے جائز نہیں اور جو ایسا کریں گے اُن کے لئے [illegible] کا اندیشہ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ۔ (النور ۲۴: ۶۲)

ایمان والے وہی ہیں جنہوں نے مانا ہے اللہ کو اور اُسکے رسول کو اور جنکا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی اجتماعی کام میں اُسکے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو کہیں نہیں جاتے تاوقتیکہ اُس سے اجازت نہ لے لیں۔

آگے اسی سلسلہ میں اُن لوگوں کے بارے میں جو بلا اجازت چپکے سے سرک جاتے تھے فرمایا گیا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (نور ۲۴: ۶۳)

پس ڈرنا چاہئے اُن لوگوں کو جو خلاف چلتے ہیں اُسکے حکم سے اس بات سے کہ مبتلا ہوں وہ کسی سخت فتنہ میں یا پہنچے اُن کو دردناک عذاب۔

رسول کے مقام و منصب کا بیان ایک مستقل موضوع ہے اور اگر اس پر شرح وبسط سے لکھا جائے تو جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے اور بلا مبالغہ سیکڑوں آیتیں اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں اس وقت ان ہی اشارات پر اکتفا کر کے میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب قرآن مجید سے آپ کا مطاع، متبوع، امام و ہادی، آمر و ناہی، حاکم و حَکَم وغیرہ وغیرہ ہونا ثابت ہو گیا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ میں آپ کا ہر امر و نہی، ہر حکم و فیصلہ اور ہر قول و عمل واجب التسلیم اور لازمُ القبول ہے۔

آنحضرت ﷺ جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے امت نے آپکی اور آپکے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی یہی حیثیت سمجھی اور آپکے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے اور آپکے اعمال و افعال کو بچشم خود دیکھنے والے صحابۂ کرامؓ نے علم و ہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کیساتھ حفاظت کی اور پوری امانت کیساتھ بعد والوں کو پہنچایا، پھر بعد کے قرنوں میں اللہ تعالیٰ نے آپکی امت کے بہترین افراد کو احادیث و سنن کے اس بے پایاں دفتر کی تدوین و ترتیب، تحقیق و تنقید، تعلیم و تعلم، ترجمہ و تشریح، حفظ و اشاعت اور اُس سے متعلق بہت سے مستقل علوم و فنون[1] کی ایجاد اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف و تصنیف وغیرہ سیکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی جو کبھی کسی قوم اور کسی امت کو نہیں ملی ...... اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر خاتم الانبیاء ﷺ کو اس دنیا سے گئے ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے لیکن آپکے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی ہر راہرو کیلئے آج بھی ایسی ہی موجود ہے جیسی کہ قرنِ اول میں تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت ختم کر دیئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاتم النبیین ﷺ کی ہدایات و تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی حفاظت کا یہ انتظام ہونا ضروری بھی تھا جبکہ آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے اور آپ ہی اس دینا کی آخری نسل تک کے لئے جب نبی ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کی تعلیمات و ہدایات اور آپ کا اسوۂ حسنہ اس دنیا کے آخری دن تک محفوظ رہے تاکہ ہر زمانہ کے طالبانِ ہدایت اُس سے وہ روشنی اور وہ نور حاصل کر سکیں جو آپ کے زمانہ میں آپ پر ایمان لانے والے خوش نصیب آپ کی مقدس اور منور ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے ..... آج کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل یہ انتظام رہا ہے، اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ خداوندی انتظام یوں ہی رہے گا اور اُس مقصد کے لئے جب جس خدمت کی ضرورت ہو گی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندوں کو اس کی توفیق ملتی رہے گی۔

"معارف الحدیث" کی تالیف جس کی توفیق عزیز گرامی مولانا محمد منظور نعمانی سلمہ اللہ تعالیٰ وابقہ کو

---

[1] حدیث و سنت سے متعلق ساٹھ سے اوپر مستقل علوم و فنون ہیں جن میں سے بعض بعض پر بلا مبالغہ ہزاروں تصانیف ہیں اگر صرف علوم حدیث سے متعلق تصانیف کی کوئی مکمل فہرست تیار کی جائے تو کئی ہزار صفحات پر آئے گی۔ ۱۲

ملی ہے اسی سلسلہ کی ایک تازہ خدمت اور محنت ہے۔

مقدمہ کو ختم کرتے ہوئے کتاب پر کسی رسمی تبصرہ کے بجائے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسکو قبول فرمائے اور اپنے بندوں کو اس سے نفع پہنچائے اور جو حصے ابھی باقی ہیں انکی تکمیل کی مؤلف کو جلد توفیق عطا فرمائے۔

حبیب الرحمن الاعظمی

۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۳ھ

لکھنؤ

معارفُ الحدیث

جلد اوّل

کتابُ الایمان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ بَعَثَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا م بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَۃِ ، مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ رَشَدَ وَاھْتَدٰی وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّہٗ لَا یَضُرُّ اِلَّا نَفْسَہٗ وَ سَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰاکِرِیْنَ ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِ نَا اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○

صرف وہی عمل قابلِ قبول ہے جو اللہ کیلئے ہو

۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ہِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَہِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ہِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُہَا اَوِ امْرَءَ ۃٍ یَتَزَوَّجُہَا فَہِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ہَاجَرَ اِلَیْہِ۔

(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ: "سب انسانی اعمال کا دارومدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے، تو جس شخص نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی (اور خدا و رسول کی رضاجوئی و اطاعت کے سوا اسکی ہجرت کا اور کوئی باعث نہ تھا) تو اس کی ہجرت در حقیقت اللہ و رسول ہی کی طرف ہوئی (اور بیشک وہ اللہ و رسول کا سچا مہاجر ہے اور اس کو اس ہجرت الی اللہ والرسول کا مقرر اجر ملے گا) اور جو کسی دنیاوی غرض کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر "مہاجر" بنا تو (اس کی ہجرت اللہ و رسول کے لئے نہ ہوگی، بلکہ) فی الواقع جس دوسری غرض اور نیت سے اس نے ہجرت اختیار کی ہے عنداللہ بس اسی کی طرف اس کی ہجرت مانی جائے گی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح...... حدیث کا جو ترجمہ اوپر کیا گیا ہے وہ خود مطلب خیز ہے اور نفسِ مفہوم کے بیان کیلئے اس کے بعد کسی مزید تشریح کی حاجت نہیں، لیکن اس کی خصوصی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ اس کے مطالب و فوائد پر کچھ اور بھی لکھا جائے۔

حدیث کا اصل منشاء امت پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ تمام اعمال کے صلاح و فساد اور مقبولیت و مردودیت کا مدار نیت پر ہے، یعنی عملِ صالح وہی ہوگا اور اُسی کی اللہ کے یہاں قدر و قیمت ہوگی جو صالح نیت سے کیا گیا ہو۔ اور جو "عملِ صالح" کسی بُری غرض اور فاسد نیت سے کیا گیا ہو وہ صالح اور مقبول نہ ہوگا، بلکہ نیت کے مطابق فاسد اور مردود ہوگا، اگرچہ ظاہری نظر میں "صالح" ہی معلوم ہو...... حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ عمل کے ساتھ نیت کا اور ظاہر کے ساتھ باطن کا بھی دیکھنے والا ہے اسکے یہاں ہر عمل کی قدر و قیمت عمل کرنے والے کی نیت کے حساب سے لگائی جائیگی۔

ایک غلط فہمی

کسی کو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جب دارومدار نیت ہی پر ہو تو اگر برے کام بھی کسی اچھی نیت سے کئے جائیں تو وہ اعمال صالحہ ہو جائیں گے اور ان پر بھی ثواب ملے گا مثلاً اگر کوئی شخص اس نیت سے چوری اور ڈاکہ زنی کرے کہ جو مال اس سے حاصل ہوگا اُس سے وہ غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے گا تو وہ بھی ثواب کا مستحق ہو سکے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ جو کام فی نفسہ برے ہیں اور جن سے اللہ اور اسکے رسول نے منع فرمایا ہے اُن میں حُسنِ نیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ تو بہر حال قبیح اور موجبِ غضبِ الٰہی ہیں، بلکہ انکے ساتھ اچھی نیت کرنا اور ان پر ثواب کی امید رکھنا شاید انکی مزید قباحت کا اور سزا میں زیادتی کا باعث ہو، کیونکہ یہ اللہ کے دین کیساتھ ایک قسم کا تلاعب (کھیل) ہوگا، بلکہ حدیث کا منشا [illegible] کے متعلق یہ جتلانا ہے کہ وہ بھی اگر کسی بری نیت سے کئے جائیں گے تو پھر [illegible] نہیں رہیں گے، بلکہ بُری نیت کی وجہ سے انکا انجام بُرا ہی ہوگا۔ مثلاً جو شخص نماز نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتا ہے جسکو ہم اعلیٰ درجہ کا عمل صالح سمجھتے ہیں وہ اگر یہ خشوع و خضوع اسلئے کرتا ہے کہ لوگ اسکی دینداری اور خدا پرستی کے متعلق اچھی رائے قائم کریں اور اسکا اعزاز و اکرام کیا جائے، تو اس حدیث کی رو سے اسکی یہ خشوع و خضوع والی نماز اللہ کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی، یا مثلاً ایک شخص دار الکفر سے دار الایمان کی طرف ہجرت کرتا ہے، اور اس کیلئے ہجرت کی ساری مشقتیں اور مصیبتیں سہتا ہے لیکن اسکی غرض اس ہجرت سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہیں بلکہ کوئی اور دنیاوی غرض پوشیدہ ہے، مثلاً دار الہجرت میں رہنے والی کسی عورت سے نکاح کی خواہش اس ہجرت کیلئے محرک ہوئی ہے تو یہ ہجرت ہجرت اسلام نہ ہوگی اور اللہ کے ہاں اسکا کوئی اجر نہ ہوگا، بلکہ الٹا گناہ ہوگا، بس یہی ہے اس حدیث کا اصل منشاء۔

[illegible]

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین شخصوں کے متعلق عدالت الٰہیہ سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ سب سے پہلے ایسے شخص کی پیشی ہوگی جو جہاد میں شہید ہوا ہوگا۔ وہ جب حاضرِ عدالت ہوگا تو اللہ تعالیٰ پہلے اسکو اپنی نعمتیں جتلائے گا اور یاد دلائے گا وہ اس کو یاد آجائیں گی پھر اس سے فرمایا جائے گا بتلا تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ اور کیا عمل کئے؟ وہ عرض کرے گا خداوندا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور تیری رضا طلبی میں جانِ عزیز تک قربان کر دی، حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو صرف اس لئے جہاد کیا تھا کہ تو بہادر مشہور ہو، تو دنیا میں تیری بہادری کا چرچا ہو چکا، پھر اللہ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اسی طرح ایک [illegible] اور [illegible] حاضرِ عدالت کیا جائے گا اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تو نے کیا اعمال کیے؟ وہ کہے گا میں نے تیرے دین اور تیری کتاب کے علم کو پڑھا اور پڑھایا، اور یہ سب تیری رضا کیلئے کیا، حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو نے تو عالم، قاری، اور مولانا کہلانے کیلئے یہ سب کچھ کیا تھا پھر بحکم خداوندی اس کو بھی دوزخ میں ڈال دیا جائے گا......
پھر اسکے بعد ایک شخص پیش ہوگا جس کو اللہ نے بہت کچھ مال و دولت دیا ہوگا، اس سے بھی سوال کیا جائے گا کہ تو نے کیا کیا؟ وہ عرض کریگا کہ خداوندا میں نے خیر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں تیری رضا جوئی کیلئے اپنا مال نہ خرچ کیا ہو، حق تعالیٰ فرمائیگا تو جھوٹا ہے تو نے تو صرف اسلئے مال خرچ کیا تھا کہ دنیا تجھ کو سخی کہے تو دنیا میں تیری سخاوت کا خوب چرچا ہو لیا۔ پھر اسکو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ [illegible]

(اللہ پناہ میں رکھے نیتوں کے فساد بالخصوص ریاء و نفاق سے۔ آمین)

الغرض اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل کام آنے گا جو صالح نیت سے یعنی محض رضائے الٰہی کے لئے کیا گیا ہو، دین کی خاص اصطلاح میں اسی کا نام اخلاص ہے۔

قرآن مجید میں مخلصوں اور غیر مخلصوں کی ایک مثال

قرآن پاک کی ذیل کی دو آیتوں میں صدقات و خیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک وہ لوگ جو مثلاً دنیا کے دکھاوے کیلئے اپنا مال مصارفِ خیر میں صرف کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو محض اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں، ان دونوں گروہوں کے ظاہری عمل میں قطعی یک رنگی ہے، اور ظاہر ہے کہ آنکھ ان کے درمیان کسی فرق کا حکم نہیں کر سکتی لیکن قرآن پاک بتلاتا ہے کہ چونکہ ان کی نیتیں مختلف ہیں اسلئے ان دونوں کے عمل کے نتیجے بھی مختلف ہیں، ایک کا عمل سراسر برکت ہے اور دوسرے کا بالکل اکارت:

كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَـآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

اُس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی آگئی ہو، (اور اس پر کچھ سبزہ جم آئے) پھر اس پر زوروں کی بارش گرے جو
اس کو بالکل صاف کردے، تو ایسے ریاکار لوگ اپنی کمائی کا کچھ بھی پھل نہ لے سکیں گے اور ان منکر لوگوں کو اللہ اپنی ہدایت اور اس کے میٹھے پھل سے محروم ہی رکھے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۔ (بقرہ ۲: ۲۶۵)

اور اُن لوگوں کی مثال جو محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے اور اپنے نفسوں کو ایثار و انفاق، اور راہِ خدا میں قربانی کا خوگر بنانے کے لئے اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُس پھولنے پھلنے والے باغ کی سی ہے جو ٹیکری پر واقع ہو اُس پر جب زوروں کی بارش ہو تو دوگنا چوگنا پھل لائے۔

تو اگرچہ ان دونوں نے بظاہر یکساں طور پر اپنا مال غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں پر خرچ کیا، مگر چونکہ ایک کی نیت محض دکھاوے کی تھی اس لئے لوگوں کے دیکھ لینے یا زیادہ سے زیادہ اُن کی وقتی داد و تحسین کے سوا اسکو کچھ حاصل نہ ہوا، کیونکہ اس کی غرض اس انفاق سے اس کے سوا کچھ اور تھی ہی نہیں...... لیکن دوسرے نے چونکہ اس ایثار و انفاق سے صرف اللہ کی رضا مندی اور اس کا فضل و کرم چاہا تھا اس لئے اللہ نے اس کو اس کی نیت کے مطابق پھل دیا۔

بس یہی وہ سنتُ اللہ اور قانونِ خداوندی ہے جس کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا ہے۔

اس دنیا میں صرف ظاہر پر تمام فیصلے کئے جاتے ہیں اور آخرت میں نیتوں پر کئے جائیں گے

یہ عالم جس میں ہم ہیں اور ہم کو جس میں کام کرنیکا موقع دیا گیا ہے [illegible] اور [illegible] ہے اور ہمارے حواس و ادراکات کا دائرہ بھی یہاں صرف ظاہر اور مظاہر ہی تک محدود ہے، یعنی یہاں ہم ہر شخص کا صرف

ظاہری چال چلن دیکھ کر ہی اسکے متعلق اچھی یا بُری رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اور اسی کی بنیاد پر اسکے ساتھ معاملہ کر سکتے ہیں، ظاہری اعمال پر سے انکی نیتوں، دل کے بھیدوں اور سینوں کے رازوں کے دریافت کرنے سے ہم قاصر ہیں اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا: نحن نحکم بالظاهر والله يتولى السرائر (یعنی ہمارا کام ظاہر پر حکم لگانا ہے اور مخفی راز اللہ کے سپرد ہیں) لیکن عالم آخرت میں فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہوگا اور وہاں اس کا فیصلہ نیتوں اور دل کے ارادوں کے لحاظ سے ہوگا، گویا احکام کے بارے میں جس طرح یہاں ظاہری اعمال اصل ہیں اور کسی کی نیت پر یہاں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا، اسی طرح وہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا، اور حق تعالیٰ کا فیصلہ نیتوں پر ہوگا، اور ظاہری اعمال کو ان کے تابع رکھا جائے گا۔

حدیث کی خصوصی اہمیت

یہ حدیث اُن [illegible] میں سے یعنی رسول اللہ [illegible] کے اُن مختصر مگر جامع اور وسیع المعنی ارشادات میں سے ہے جو مختصر ہونے کے باوجود دین کے کسی بڑے اہم حصہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اور [illegible] کے مصداق ہیں۔ یہاں تک کہ بعض آئمہ نے کہا ہے کہ [illegible] کا ایک تہائی حصہ اس حدیث میں آگیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ان آئمہ نے فرمایا مبالغہ نہیں ہے بلکہ عین حقیقت ہے کیونکہ اصولی طور پر اسلام کے تین ہی شعبے ہیں۔ ایمان (یعنی اعتقادیات) اعمال اور اخلاص۔ چونکہ یہ حدیث اخلاص کے پورے شعبہ پر حاوی ہے اسلئے کہا جاتا ہے کہ اسلام کا ایک تہائی حصہ اس میں آگیا ہے...... اور پھر اخلاص وہ چیز ہے جس کی ضرورت ہر کام میں اور ہر قدم پر ہے، خاص کر جب بندہ کوئی اچھا سلسلہ شروع کرے خواہ وہ علمی ہو یا عملی تو وہ اسکا حاجتمند ہوتا ہے کہ رسول اللہ [illegible] کا یہ ارشاد اسکے سامنے ہو، اس لئے بعض اکابر نے اپنی مؤلفات کو اسی حدیث سے شروع کرنا بہتر سمجھا ہے چنانچہ امام بخاری نے اپنی [illegible] کو اور ان کے بعد امام بغوی نے [illegible] کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے، گویا اسی کو [illegible] بنایا ہے اور حافظ الحدیث ابن مہدی سے منقول ہے کہ جو شخص کوئی دینی کتاب تصنیف کرے اچھا ہو کہ وہ اسی حدیث سے اپنی کتاب کا آغاز کرے (آگے فرمایا) اور اگر میں کوئی کتاب لکھوں تو اسکے ہر باب کو اسی حدیث سے شروع کروں گا۔ [illegible]

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ اس ناچیز نے بھی اسی لئے اس حدیث پاک سے اپنی اس کتاب کا آغاز کیا ہے، اللہ تعالیٰ بخیر اتمام کی توفیق دے اور قبول فرمائے نیز اس ناچیز کو اور کتاب کے تمام ناظرین کو اخلاص و حسن نیت نصیب فرمائے۔

(اسکے بعد ایک خاص ترتیب سے وہ حدیثیں درج ہوں گی جن میں رسول اللہ [illegible] نے ایمان و اسلام کا یا ان کے ارکان اور شعبوں کا یا ان کے لوازم و شرائط کا یا ان کے برکات و ثمرات کا یا انکے مفسدات و مناقضات کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے [illegible] درج کی جا رہی ہے جو اصولی طور پر دین کے سارے شعبوں پر حاوی ہونے کی وجہ سے [illegible] کہی جاتی ہے)

اسلام، ایمان اور احسان

(حدیث جبرئیل)

[illegible] عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ [illegible] ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ

عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَقَالَ يَامُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِى الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَاَخْبِرْ نِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ؟ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ قَالَ صَدَقْتَ، قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ، قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ؟ قُلْتُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرَئِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ۔ (رواه مسلم)

حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے (اسی حدیث کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس مبارک میں صحابہ کا ایک مجمع تھا اور حضرت ان سے خطاب فرمارہے تھے۔ فتح) کہ اچانک ایک شخص سامنے سے نمودار ہوا، جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت ہی زیادہ سیاہ تھے۔ اور اس شخص پر سفر کا کوئی اثر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، (جس سے خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی بیرونی شخص نہیں ہے) اور اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ ہم میں سے کوئی شخص اس نووارد کو پہچانتا نہ تھا (جس سے خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی باہری آدمی ہے، تو یہ حاضرین کے حلقہ میں سے گزرتا ہوا آیا) یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر دوزانو اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے آنحضرت کے گھٹنوں سے ملادیئے۔ اور اپنے ہاتھ حضور کی رانوں پر رکھ دیئے اور کہا اے محمد! مجھے بتلایئے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے (یعنی اس کے ارکان یہ ہیں کہ دل وزبان سے) تم یہ شہادت ادا کرو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (کوئی ذات عبادت وبندگی کے لائق) نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور ماہ رمضان کے روزے رکھو، اور اگر حج بیتُ اللہ کی تم استطاعت رکھتے ہو تو حج کرو، اس نووارد سائل نے آپ کا یہ جواب سن کر کہا، آپ نے سچ کہا۔ راوی حدیث حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ شخص پوچھتا بھی ہے اور پھر خود تصدیق و تصویب بھی کرتا جاتا ہے، اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا اب مجھے بتلایئے کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو اور اُس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخر یعنی روزِ قیامت کو حق جانو اور حق مانو اور ہر خیر و شر کی تقدیر کو بھی حق جانو اور حق مانو، (یہ سن کر بھی) اس نے کہا، آپ نے سچ کہا۔ اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا، مجھے بتلایئے کہ احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت وبندگی تم اس طرح کرو گویا تم اس کو

دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تو تم کو دیکھتا ہی ہے، پھر اُس شخص نے عرض کیا مجھے قیامت کی بابت بتلایئے (کہ وہ کب واقع ہوگی) آپ نے فرمایا کہ جس سے یہ سوال کیا جارہا ہے وہ اس کو سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ پھر اس نے عرض کیا تو مجھے اس کی کچھ نشانیاں ہی بتلایئے؟ آپ نے فرمایا (اس کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ) لونڈی اپنی مالکہ اور آقا کو جنے گی، (اور دوسری نشانی یہ ہے کہ) تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا اور تن پر کپڑا نہیں ہے، اور جو تہی دست اور بکریاں چرانے والے ہیں وہ بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں گے اور اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ باتیں کر کے یہ نووارد شخص چلا گیا، پھر مجھے کچھ عرصہ گزر گیا، تو حضور نے مجھ سے فرمایا، اے عمر! کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہ سوال کرنے والا شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ جبرئیل تھے، تمہاری اس مجلس میں اسلئے آئے تھے کہ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھادیں۔

(یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے اور صحیح بخاری و مسلم میں یہی واقعہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی مروی ہے)

تشریح..... اس حدیث میں سائل کے سوال کے جواب میں آنحضرت نے پانچ امور کا بیان فرمایا ہے، اسلام، دوسرے ایمان، تیسرے احسان، چوتھے قیامت کے متعلق انتباہ کہ اس کا وقت خاص اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں، اور پانچویں قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی بعض علامات..... ان پانچوں چیزوں کے متعلق جو کچھ اس حدیث میں بیان فرمایا ہے وہ تشریح طلب ہے۔

(۱) اسلام..... کے اصل معنی ہیں اپنے کو کسی کے سپرد کردینا، اور بالکل اُسی کے تابع فرمان ہوجانا..... اور اللہ کے بھیجے ہوئے اور اس کے رسولوں کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام اسی لئے ہے کہ اُس میں بندہ اپنے آپ کو بالکل مولا کے سپرد کردیتا ہے، اور اس کی مکمل اطاعت کو اپنا دستورِ زندگی قرار دے لیتا ہے، اور یہی اصل حقیقت "دینِ اسلام" کی اور اسی کا مطالبہ ہے ہم سے۔ فرمایا گیا "فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا" (الحج ۲۲: ۳۴) (تمہارا اللہ وہی الٰہ واحد ہے، لہٰذا تم اسی کے "مسلم" یعنی مطیع ہوجاؤ) اور اسی اسلام کے متعلق فرمایا گیا ہے "وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ" (النساء ۴: ۱۲۵) (اور اس سے بہتر کون ہوسکتا ہے جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کردیا اور وہ اس طرح "مسلم بندہ" ہوگیا) اور اسی اسلام کے متعلق اعلان فرمایا گیا ہے "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (آل عمران ۳: ۸۵) (یعنی جس نے "اسلام" کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہا تو وہ ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آدمی آخرت میں بڑے گھاٹے اور ٹوٹے والوں میں سے ہوگا) بہرحال "اسلام" کی اصل روح اور حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنے کو کلی طور پر اللہ کے سپرد کردے اور ہر پہلو سے اس کا مطیع فرمان بن جائے۔

پھر انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعتوں میں اس "اسلام" کے لئے کچھ مخصوص ارکان بھی ہوتے ہیں جن کی حیثیت اس "حقیقتِ اسلام" کے "[illegible]" کی سی ہوتی ہے، اور اس حقیقت کا نشوونما اور اس کی

تازگی بھی انہی سے ہوتی ہے، اور وہ صرف تعبّدی امور ہوتے ہیں، اور ظاہری نظر انہی "ارکان" کے ذریعہ فرق و امتیاز کرتی ہے۔ ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے اپنا دستورِ حیات "اسلام" کو بنایا ہے، اور ان کے درمیان جنہوں نے نہیں بنایا۔

تو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "اسلام" کا جو آخری اور مکمل دستور ہمارے پاس آیا ہے اس میں توحید خداوندی اور رسالت محمدی کی شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کو "ارکانِ اسلام" قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ الخ" (یعنی اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر ہے)

بہر حال یہ پانچ چیزیں جن کو آپ نے یہاں اس حدیث میں "اسلام" کے جواب میں بیان فرمایا "ارکانِ اسلام" ہیں اور یہی گویا "اسلام" کے لئے "ظاہری محسوس" ہیں۔ اسی واسطے اس حدیث میں انہی کے ذریعہ اسلام کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۲) ایمان..... کے اصل معنی کسی کے اعتبار اور اعتماد پر کسی بات کو سچ ماننے کے ہیں[1] اور دین کی خاص اصطلاح میں ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر ایسی حقیقتوں کے متعلق جو ہمارے حواس اور آلات ادراک کے حدود سے ماوراء ہوں جو کچھ بتلائیں اور ہمارے پاس جو علم اور جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائیں ہم ان کو سچا مان کر اس میں ان کی تصدیق کریں اور اس کو حق مان کر قبول کر لیں۔ بہر حال شرعی ایمان کا تعلق اصولاً امورِ غیب ہی سے ہوتا ہے جن کو ہم اپنے آلاتِ احساس و ادراک (آنکھ، ناک، کان وغیرہ) کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے[2]۔ مثلاً اللہ اور اس کی صفات اور اس کے احکام اور رسولوں کی رسالت اور ان پر وحی کی آمد، اور مبداء و معاد کے متعلق ان کی اطلاعات، وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کی جتنی باتیں اللہ کے رسول نے بیان فرمائیں ان سب کو ان کی سچائی کے اعتماد پر حق جان کر ماننے کا نام اصطلاح شریعت میں ایمان ہے، اور پیغمبر کی اس قسم کی کسی ایک بات کو نہ ماننا یا اس کو حق نہ سمجھنا ہی اس کی تکذیب ہے، جو آدمی کو ایمان کے دائرہ سے نکال کر کفر کی سرحد میں داخل کر دیتی ہے[3]۔ پس آدمی کے مؤمن ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ "کُلُّ مَا جَاءَ بِهِ الرَّسُوْلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کی (یعنی تمام ان چیزوں اور حقیقتوں کی جو اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائے) تصدیق کی جائے اور ان کو حق مان کر قبول کیا جائے..... لیکن ان سب چیزوں کی پوری

---

[1] فی التنزیل وما انت بمؤمن لنا ولو کنا صادقین سورۂ یوسف ۱۴ ع ۱۲

[2] اسی واسطے "ایمان" کے ساتھ بالغیب کی قید بھی لگائی جاتی ہے۔ کما قال تعالیٰ یؤمنون بالغیب

[3] جو لوگ اللہ کے کسی پیغمبر کی حیات مقدسہ میں براہ راست ان کی زبان سے ان کی ہدایت اور تعلیم سنیں ان کیلئے تو ان کی ہر اس بات کی تصدیق شرط ایمان ہے جو پیغمبر ان کے سامنے اللہ کی طرف سے بیان کریں۔ اگر وہ ان کی ایسی ایک بات کا بھی انکار کریں گے تو مومن نہ رہیں گے لیکن جب پیغمبر اس دنیا میں نہ رہیں تو صرف ان باتوں کی تصدیق کرنا شرط ایمان ہے جن کا ثبوت ان پیغمبر سے ایسے یقینی قطعی اور بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ دین کی ایسی تعلیمات کو خاص علمی اصطلاح میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں، ان سب پر ایمان لانا شرط ایمان ہے، اگر ان میں سے کسی کا بھی کوئی انکار کرے تو مؤمن نہیں رہے گا اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا تو اسلام سے اس کا رشتہ کٹ جائیگا۔ ۱۲

تفصیل معلوم ہونی ضروری نہیں ہے، بلکہ نفسِ ایمان کے لئے یہ اجمالی تصدیق بھی کافی ہے، البتہ کچھ خاص اہم اور بنیادی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ ایمانی دائرہ میں آنے کے لئے ان کی تصدیق تعین کے ساتھ ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث زیر تشریح میں ایمان سے متعلق سوال کے جواب میں جن امور کا ذکر فرمایا گیا ہے (یعنی اللہ، ملائکہ، اللہ کی کتابیں، اللہ کے رسول، روزِ قیامت اور ہر خیر و شر کی تقدیر) تو ایمانیات میں سے یہ وہی اہم اور بنیادی امور ہیں جن پر تعین کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے، اور اسی واسطے آنحضرت ﷺ نے ان کا ذکر صراحتاً اور تعین کے ساتھ فرمایا، اور قرآن پاک میں بھی یہ ایمانی امور اسی تفصیل اور تعین کے ساتھ مذکور ہیں۔ سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔ [1]
(بقرہ ۲: ۲۸۵)

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ [2]
(نساء ۴: ۱۳۶)

ان امورِ ششگانہ میں سے "تقدیر خیر و شر" کا ذکر قرآن پاک میں اگرچہ ان ایمانیات کے ساتھ ان آیات میں نہیں آیا ہے، لیکن دوسرے موقع پر قرآن پاک نے اس کو بھی صراحتاً بیان فرمایا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ [3] (نساء ۴: ۷۸)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

" فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا الآية" [4] (انعام ۶: ۱۲۵)

اب مختصراً یہ بھی معلوم کرنا چاہئے کہ ان سب پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟

سو اللہ پر ایمان لانے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے موجود وحدہٗ لا شریک خالق کائنات اور ربّ العالمین ہونے کا یقین کیا جائے، عیب و نقص کی ہر بات سے پاک، اور ہر صفتِ کمال سے اس کو متّصف سمجھا جائے۔ اور ملائکہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ مخلوقات میں ایک مستقل نوع کی حیثیت سے ان کے وجود کو حق مانا

---

[1] رسول پر جو ہدایت اور تعلیم نازل ہوئی خود رسول کا بھی اس پر ایمان ہے اور سب مؤمنوں کا بھی، یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ۱۲

[2] جو بھی اللہ اور اسکے ملائکہ اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں اور یوم آخر سے کفر کرے یعنی ان پر ایمان نہ لائے وہ بہت ہی زیادہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بہت دور نکل گیا ۱۲۔

[3] اے پیغمبر! آپ اعلان فرما دیجئے کہ ہر چیز خدا کی طرف سے اور اس کے حکم سے ہے ۱۲

[4] اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے "اسلام" کے ماننے اور قبول کرنے کے لئے اس کے سینے کو کھول دیتا ہے اور جس کے متعلق اس کا فیصلہ ضلالت کا ہوتا ہے اس کے سینے کو بھینچا ہوا اور تنگ کر دیتا ہے ۱۲

جائے اور یقین کیا جائے کہ وہ اللہ کی ایک پاکیزہ اور محترم مخلوق ہے بل عباد مکرمون [1] (انبیاء ۲۱:۲۶) جس میں شر اور شرارت اور عصیان و بغاوت کا عنصر ہی نہیں بلکہ ان کا کام صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے (لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون [2]) (تحریم ۶۶:۶) ان کے متعلق کام ہیں اور ان کی ڈیوٹیاں (فرائض) ہیں جن کو وہ خوبی سے انجام دیتے ہیں۔

ملائکہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

ملائکہ کے وجود پر یہ شبہ کہ اگر وہ موجود ہوتے تو نظر آتے سخت جاہلانہ شبہ ہے۔ دنیا میں کتنی ہی چیزیں ہیں جو باوجود موجود ہونے کے ہم کو نظر نہیں آتیں، کیا زمانۂ حال کی خوردبینوں کی ایجاد سے پہلے کسی نے پانی میں، ہواؤں اور خون کے قطرہ میں وہ جراثیم دیکھے تھے جن کو خوردبین سے آج ہر آنکھ والا دیکھ سکتا ہے اور کیا کسی آلہ سے بھی ہم اپنی روح کو دیکھ پاتے ہیں۔ تو جسطرح ہماری آنکھ خود اپنی روح کو دیکھنے سے اور بغیر خوردبین کے پانی وغیرہ کے جراثیم دیکھنے سے عاجز ہے، اسی طرح فرشتوں کو دیکھنے سے بھی وہ قاصر ہے...... اور پھر کیا اسکی کوئی دلیل ہے کہ جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے وہ موجود نہیں ہو سکتی؟ کیا ہماری آنکھوں اور ہمارے حواس نے کل عالم موجودات کا احاطہ کر لیا ہے؟ ایسی بات خاص کر اس زمانہ میں جب کہ روز روز نئے انکشافات ہو رہے ہیں، کوئی بڑا احمق ہی کہہ سکتا ہے، دراصل انسان کا علم اور اس کے علمی ذرائع بہت ہی ناقص اور محدود ہیں۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵)

اور اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اللہ پاک نے اپنے رسولوں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ہدایت نامے بھیجے، ان میں سب سے آخر اور سب کا خاتم قرآن مجید ہے۔ جو پہلی سب کتابوں کا مصدق اور مہیمن بھی ہے، یعنی اُن کتابوں میں جتنی ایسی باتیں تھیں جن کی تعلیم و تبلیغ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ضروری ہوتی ہے وہ سب اس قرآن میں لے لی گئی ہیں، گویا یہ تمام کتبِ سماویہ کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کر دینے والی خدا کی آخری کتاب ہے اور چونکہ وہ کتابیں اب محفوظ بھی نہیں رہیں اسلئے اب صرف یہی کتاب ہدایت ہے جو سب کے قائم مقام اور سب سے زیادہ مکمل ہے اور زمانۂ آخر تک اس کی حفاظت کی ذمہ داری اسی لئے خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (الحجر ۱۵:۹)

اور "اللہ کے رسولوں" پر ایمان لانا یہ ہیکہ اس واقعی حقیقت کا یقین کیا جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کیلئے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی "ہدایت" اور اپنی رضامندی کا دستور دے کر بھیجا ہے، اور انہوں نے پوری امانت و دیانت کے ساتھ خدا کا وہ پیغام بندوں کو پہنچا دیا، اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی پوری پوری کوششیں کیں، یہ سب پیغمبر اللہ کے برگزیدہ اور صادق بندے تھے (ان میں سے چند کے نام اور کچھ حالات بھی قرآن کریم میں ہم کو بتلائے گئے ہیں اور بہت سوں کے نہیں بتلائے گئے منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک (غافر ۴۰:۷۸)

---

[1] بلکہ وہ محترم اور باعزت بندے ہیں ۱۲۔

[2] وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے، جو حکم ان کو دیا جاتا ہے وہ اس کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ ۱۲

بہر حال خدا کے ان سب رسولوں کی تصدیق کرنا اور بحیثیت پیغمبری ان کا پورا پورا احترام کرنا ایمان کے شرائط میں سے ہے، اور اسی کے ساتھ اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ نے اس سلسلۂ نبوت و رسالت کو حضرت محمد ﷺ پر ختم کر دیا، آپ خاتم الانبیاء اور خدا کے آخری رسول ہیں اور اب قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے نجات و فلاح آپ ہی کی اتباع اور آپ ہی کی ہدایت کی پیروی میں ہے۔ صلی اللہ وسلم علیہ و علی سائر الانبیاء والمرسلین و علی کل من اتبعھم باحسان الی یوم الدین۔

اور "ایمان بالیوم الآخر" یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دُنیا ایک دن قطعی طور پر فنا کر دی جائے گی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر سارے مُردوں کو جلائے گا اور یہاں جس نے جیسا کچھ کیا ہے اسی کے مطابق جزا یا سزا اس کو دی جائے گی۔

معلوم ہونا چاہئے کہ چونکہ دین و مذہب کے سارے نظام کی بنیاد اس حیثیت سے جزا و سزا ہی کے عقیدہ پر ہے کہ اگر آدمی اس کا قائل نہ ہو تو پھر وہ کسی دین و مذہب اور اسکی تعلیمات و ہدایات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے ہی کی ضرورت کا قائل نہ ہوگا، اس لئے ہر مذہب میں خواہ وہ انسانوں کا خود ساختہ ہو یا اللہ کا بھیجا ہوا، "جزاء و سزا" کو بطور بنیادی عقیدہ کے تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر انسانی دماغوں کے بنائے ہوئے مذاہب میں اس کی شکل تناسخ وغیرہ تجویز کی گئی ہے، لیکن خدا کی طرف سے آئے ہوئے ادیان و مذاہب کُل کے کُل اس پر متفق ہیں کہ اس کی صورت وہی حشر و نشر کی ہوگی جو اسلام بتلاتا ہے اور قرآن پاک میں اُس پر اس قدر استدلالی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کوئی اعلیٰ درجہ کا احمق اور انتہائی قسم کا ناسمجھ ہی ہوگا جو اُن قرآنی دلائل و براہین کے سامنے آجانے کے بعد بھی حشر و نشر اور بعث بعد الموت کو ناممکن اور محال یا مستبعد بھی کہے۔

اور "ایمان بالقدر" یہ ہے کہ اس بات پر یقین لایا جائے اور مانا جائے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے (خواہ وہ خیر ہو یا شر) وہ سب اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے ہے۔ جس کو وہ پہلے ہی طے کر چکا ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ تو کچھ اور چاہتا ہو اور دُنیا کا یہ کارخانہ اُس کی منشاء کے خلاف اور اس کی مرضی کے علی الرغم چل رہا ہو، ایسا ماننے میں خدا کی انتہائی عاجزی اور بیچارگی لازم آئے گی۔ [1]

۳) احسان..... اسلام و ایمان کے بعد سائل نے تیسرا سوال رسول اللہ ﷺ سے "احسان" کے متعلق کیا

---

[1] یہاں اسی ایک خط کشیدہ فقرہ میں مسئلہ تقدیر کے مشکل ترین پہلو کو سمجھانے کیلئے سمجھ سکنے والوں کے واسطے ایک مختصر مگر کافی و افی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے اس مضمون کو پورے شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح مسلم کی شرح "فتح الملہم" میں اسی "حدیث جبرئیل" کے ذیل میں امام غزالیؒ کا وہ کلام اور اسکے علاوہ امام ابن القیمؒ اور شاہ ولی اللہ سے جو کچھ اس مسئلہ کے متعلق نقل کیا ہے اہل علم کیلئے وہ سب قابل دید اور لائق استفادہ ہے۔ اس مسئلہ پر اس سے زیادہ جامع اور طمانیت بخش کلام جس سے مسئلہ کی تمام مشکل گرہیں کھل جاتی ہوں، کہیں اور راقم السطور کی نظر سے نہیں گزرا۔ جو اہل علم اس مسئلہ کے بارے میں اطمینان اور تشفی حاصل کرنا چاہیں وہ "فتح الملہم" ہی کیطرف رجوع فرمائیں۔ چونکہ عام اردو خواں حضرات کیلئے ان دقیق مباحث کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے اسلئے ہم نے یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور جتنا کچھ سمجھنا ان کیلئے آسان ہو سکتا ہے وہ انشاء اللہ آئندہ تقدیر سے متعلق احادیث کی تشریح میں لکھا جائے گا ۱۲۔

تھا کہ "ما الاحسان؟" یعنی "احسان" کی کیا حقیقت ہے؟

یہ "احسان" بھی ایمان واسلام کی طرح خاص دینی اور بالخصوص قرآنی اصطلاح ہے۔ فرمایا گیا ہے "بلی من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه" وہاں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا اور اسکے ساتھ "احسان" کا وصف بھی اس میں ہوا تو اسکے رب کے پاس اس کے لئے خاص (اجر ہے)۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: "ومن احسن دینا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن" (اور اس سے اچھا دین میں کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی وہ محسن (یعنی صاحب احسان بھی ہے)۔

ہماری زبان اور ہمارے محاورہ میں تو "احسان" کے معنی کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں، لیکن یہاں جس "احسان" کا ذکر ہے وہ اس کے علاوہ ایک خاص اصطلاح ہے اور اس کی حقیقت وہی ہے جو حدیث زیر تشریح میں آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی یعنی خدا کی بندگی اس طرح کرنا چیسے کہ وہ قہار و قدوس اور ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جبکہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے، عموماً اُن دونوں وقتوں کے طرز عمل میں فرق ہوتا ہے، اور عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جس قدر دلی دھیان اور محنت اور خوبصورتی کے ساتھ وہ آقا کی آنکھوں کے سامنے کام کرتا اور جس خوش اسلوبی سے اس وقت وظائف خدمت کو انجام دیتا ہے، مالک کی عدم موجودگی میں اس کا حال وہ نہیں ہوتا، یہی حال بندوں کا اپنے حقیقی مولیٰ کے ساتھ بھی ہے جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میرا وہ مولیٰ حاضر ناظر ہے، میرے ہر کام بلکہ میری ہر ہر حرکت اور ہر ہر سکون کو وہ دیکھ رہا ہے، تو اس کی ایک خاص کیفیت اور اس کی بندگی میں ایک خاص شان نیاز مندی ہوگی، جو اُس وقت میں نہیں ہو سکتی جب کہ اس کا دل اس تصور اور اس احساس سے خالی ہو...... تو "احسان" یہی ہے کہ اللہ کی بندگی اس طرح کی جائے گویا کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا کہ:

(الاحسان) اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ۔

احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو مگر وہ تو تم کو دیکھتا ہی ہے۔ [1]

---

[1] حدیث کے اس ٹکڑے کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا گیا ہے (بلکہ وہی زیادہ مشہور ہے) اور وہ یہ ہے کہ عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر یہ مقام (مشاہدۂ حق کا) تمہیں حاصل نہ ہو تو پھر عبادت کرو اس طرح اور اس تصور کے ساتھ کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔ جو حضرات رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیتے ہیں اُن کے نزدیک اس میں عبادت کے دو درجوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایک یہ کہ عبادت "مشاہدۂ حق" کے ساتھ ہو (جو مقام ہے عرفاء کاملین کا) اور دوسرے یہ کہ عابد عبادت اس تصور کے ساتھ کرے کہ میں اللہ کے سامنے ہوں اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے (یہ مقام ہے درجۂ دوم کے عابدوں اور عارفوں کا)۔　　(جاری ہے)

ایک اہم ..... حدیث کے اس ٹکڑے کی تقریر و توضیح بہت سے حضرات اسطرح کرتے ہیں کہ گویا اس کا تعلق خاص "نماز" ہی سے ہے، اور گویا اسکا مطلب بس یہ ہے کہ نماز پورے خضوع و خشوع سے پڑھی جائے۔ حالانکہ حدیث کے الفاظ میں اس خصوصیت کیلئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، حدیث میں تو "تعبد" کا لفظ ہے جسکے معنی مطلق عبادت اور بندگی کے ہیں لہذا نماز کیساتھ آنحضرت کے اس ارشاد کو مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ اسی حدیث کی ایک اور روایت میں بجائے "تَعْبُدَ" کے "تخشی" کا لفظ بھی آیا ہے یعنی (الاحسان) ان تخشی اللہ کانک تراہ الخ جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "احسان" یہ ہے کہ تم خدا سے اس طرح ڈرو کہ گویا اسکو دیکھ رہے ہو۔ الخ اور اسی واقعہ کی ایک روایت میں اس موقع پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ الاحسان ان تعمل للہ کانک تراہ الخ جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "احسان" اس کا نام ہے کہ تم ہر کام اللہ کیلئے اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو" الخ۔ ان دونوں روایتوں سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ "احسان" کا تعلق صرف نماز ہی سے نہیں ہے، بلکہ انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہر عبادت و بندگی اور اس کے ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس کے مواخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔

(۴) الساعۃ ..... یعنی "قیامت"، اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالوں کے بعد آنحضرت ﷺ سے سائل نے عرض کیا تھا "فاخبرنی عن الساعۃ" یعنی مجھے قیامت کی بابت بتلائیے کہ کب آئیگی؟ آپ نے جواب دیا "ما المسئول عنها باعلم من السائل" (یعنی جس سے سوال کیا جارہا ہے اسکو خود اس بارہ میں سائل سے زیادہ علم نہیں ہے) یعنی قیامت کے وقت خاص کا علم جسطرح سائل کو نہیں ہے مجھے بھی نہیں ہے۔ اس حدیث کی ابوہریرہؓ والی روایت میں (جو صحیح بخاری میں بھی ہے) اس موقعہ پر یہ الفاظ اور ہیں "فی خمس لا یعلمها الا اللہ ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر" (یعنی رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمانے کے بعد کہ قیامت کے بارے میں (یہ فرمانے کے بعد کہ میرا علم سائل سے زیدہ نہیں ہے) یہ مزید افادہ فرمایا کہ یہ (وقت قیامت تو) ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنکے متعلق قرآن کریم کی اس آیت "ان اللہ عندہ علم الساعۃ الخ" میں اعلان کردیا گیا ہے کہ انکا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اسکے سوا انکو کوئی نہیں جانتا۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

یہ مطلب اگرچہ بعض بڑے اور مشہور ترین شارحین حدیث نے بھی بیان کیا ہے، لیکن بخیال ناقص حدیث کے الفاظ اسکو ادا نہیں کرتے اور اقرب وہی مطلب ہے جسکو اس ناچیز نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے اور امام نووی نے [illegible] میں، نیز علامہ سندی نے [illegible] میں اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کی بناپر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ٹھہراتے کہ "احسان" یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو جیسے کہ اسکو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگرچہ تم اسکو دیکھتے نہیں ہو، مگر وہ تو تم کو دیکھتا ہی ہے۔ اور جب وہ تم کو دیکھ رہا ہو تو پھر عبادت اور بندگی ایسی ہی ہونی چاہئے جیسے کہ مولیٰ کے سامنے ہوتے ہوئے ہونی چاہئے۔ کیونکہ غلام آقا کے سامنے ہوتے ہوئے اسی لئے تو کام اچھی طرح کرتا ہے کہ وہ آقا اسکو دیکھتا ہوتا ہے۔ بہر حال حسن عبادت میں اصل موثر مولیٰ کا بندہ کو دیکھنا ہے اور وہ متحقق ہی ہے۔ واللہ اعلم

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے سوال کے جواب میں بجائے یہ فرمانے کے کہ "مجھے اس کا علم نہیں" یہ پیرایۂ بیان (کہ اس بارے میں مسئول عنہ کا علم سائل سے زیادہ نہیں ہے) اس لئے اختیار فرمایا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کسی سائل اور کسی مسئول کو بھی اس کا علم نہیں ہے، اور آیت قرآنی تلاوت کر کے آپ نے اس کو اور زیادہ محکم فرمادیا۔

۵) علامات قیامت..... وقت قیامت کے متعلق مذکورہ بالا جواب پانے کے بعد سائل نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ "فاخبرني عن اماراتها" (مجھے قیامت کی کچھ نشانیاں ہی بتلایئے!) اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے دو خاص نشانیاں بیان فرمائیں۔

ایک یہ کہ "لونڈی اپنی مالکہ اور آقا کو جنے گی" اور دوسری یہ کہ نادار اور ننگے اور بھوکے لوگ جن کا کام بکریاں چرانا ہو گا وہ بھی بڑی بڑی شاندار عمارتیں بنائیں گے۔

پہلی جو نشانی آپ نے بیان فرمائی اس کا مطلب شارحین حدیث نے کئی طرح سے بیان کیا ہے، راقم کے نزدیک سب سے زیادہ راجح توجیہ یہ ہے کہ قرب قیامت میں ماں باپ کی نافرمانی عام ہو جائے گی حتیٰ کہ لڑکیاں جنکی سرشت میں ماؤں کی اطاعت اور وفاداری کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے اور جن سے ماں کے مقابلہ میں سرکشی بظاہر بہت ہی مشکل اور مستبعد ہے، وہ بھی نہ صرف یہ کہ ماؤں کے مقابلہ میں نافرمان ہو جائیں گی بلکہ الٹی اس طرح ان پر حکومت چلائیں گی جس طرح ایک مالکہ اور سیدہ اپنی زر خرید باندی پر حکومت کرتی ہے۔ اسی کو حضرت نے اس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے کہ "عورت اپنی مالکہ اور آقا کو جنے گی"۔ یعنی عورت سے جو لڑکی پیدا ہو گی وہ بڑی ہو کر خود اس ماں پر اپنی حکومت چلائے گی اور کوئی شک نہیں کہ اس نشانی کے ظہور کی ابتدا ہو چکی ہے۔

اور دوسری جو نشانی حضرت نے بیان فرمائی کہ "بھوکے ننگے اور بکریوں کے چرانے والے اونچے اونچے محل بنوائیں گے"۔ تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قرب قیامت میں دنیوی دولت و بالاتری ان اراذل کے ہاتھوں میں آئے گی جو ان کے اہل نہ ہوں گے۔ اور ان کو بس اونچے اونچے شاندار محل بنوانے سے شغف ہو گا اور اسی کو وہ سرمایۂ فخر و مباہات سمجھیں گے اور اس میں اپنی اولوالعزمی دکھائیں گے اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔

ایک دوسری حدیث میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے "اذا وُسِّدَ الامرُ الی غیرِ اھلہ فانتظرِ السّاعة" (یعنی جب حکومتی اختیارات اور مناصب و معاملات نااہلوں کے سپرد ہونے لگیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔)

زیر تشریح حدیث کے آخر میں ہے کہ اس سائل کے چلے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بتلایا کہ یہ سائل جبرئیل امین تھے اور اس لئے سائل بن کر آئے تھے کہ اس سوال وجواب کے ذریعے صحابہؓ کو دین کی تعلیم و تذکیر ہو جائے۔

اس حدیث کی بعض روایات میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت جبرئیل کی یہ آمد اور گفتگو رسول اللہ ﷺ

کی عمر شریف کے آخری حصہ میں ہوئی تھی۔ (فتح الباری و عمدۃ القاری)

گویا تئیس سال کی مدت میں جس دین کی تعلیم مکمل ہوئی تھی اللہ تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ جبرئیل کے ان سوالات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے پورے دین کا خلاصہ اور لب لباب بیان کرا کے صحابہؓ کے علم کی تکمیل کر دی جائے اور اُن کو اس امانت کا امین بنادیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کا حاصل بس تین ہی باتیں ہیں:

(۱) یہ کہ بندہ اپنے کو بالکل اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بنادے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی بنالے، اور اسی کا نام اسلام ہے اور ارکان اسلام اسی حقیقت کے مظاہر ہیں۔

(۲) اُن اہم غیبی حقیقتوں کو مانا جائے اور اُن پر یقین کیا جائے جو اللہ کے پیغمبروں نے بتلائیں اور جن کو ماننے کی دعوت دی اور اسی کا نام ایمان ہے۔

(۳) اور اللہ نصیب فرمائے تو اسلام و ایمان کی منزلیں طے کر لینے کے بعد تیسری اور آخری تکمیلی منزل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایسا استحضار اور دل کو مراقبۂ حضور و شہود کی ایسی کیفیت نصیب ہو جائے کہ اس کے احکام کی تعمیل اور اُس کی فرمانبرداری و بندگی اس طرح ہونے لگے کہ گویا اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے اور اسی کیف و حال کا نام احسان ہے۔

اسی طرح اس سوال و جواب میں گویا پورے دین کا خلاصہ اور عطر آگیا، اور اسی لئے اس حدیث کو علما نے "ام السنۃ" بھی کہا ہے، گویا جس طرح قرآن مجید کے تمام اہم مطالب اور مضامین پر بالاجمال حاوی ہونے کی وجہ سے سورۂ فاتحہ کا نام "ام الکتاب" ہے اسی طرح یہ حدیث اپنی اس جامع حیثیت کی وجہ سے "ام السنۃ" کہی جانے کی مستحق ہے اور اس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے امام مسلم نے اپنی جلیل القدر کتاب صحیح مسلم کو مقدمہ کے بعد اسی حدیث سے شروع کیا ہے، اور امام بغوی نے بھی اپنی دونوں تالیفوں "مصابیح" اور "شرح السنۃ" کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔

یہ حدیث حضرت عمرؓ کی روایت سے جس طرح کہ یہاں نقل کی گئی صحیح مسلم میں ہے اور صحیح مسلم اور صحیح بخاری دونوں میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی یہ واقعہ مروی ہے اور دوسری کتب حدیث میں اور بھی چند صحابہ کرام سے یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے۔

ارکانِ اسلام

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔
(رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم کی گئی ہے، ایک اس حقیقت کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں (کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں) اور محمد اُسکے بندے اور اُسکے رسول ہیں، دوسرے نماز قائم کرنا،

تیسرے زکوٰۃ ادا کرنا، چوتھے حج کرنا، پانچویں رمضان کے روزے رکھنا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح ..... اس حدیث میں رسول اللہ (ﷺ) نے استعارہ کے طور پر اسلام کو ایسی عمارت سے تشبیہ دی ہے' جو چند ستونوں پر قائم ہو' اور بتلایا ہے کہ عمارتِ اسلام ان پانچ ستونوں پر قائم ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان ارکان کے ادا کرنے اور قائم کرنے میں غفلت کرے، کیونکہ یہ اسلام کے بنیادی ستون ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام کے فرائض ان ارکانِ خمسہ ہی میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً جہاد فی سبیل اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ، لیکن جو اہمیت اور جو خصوصیت ان پانچ کو حاصل ہے' وہ چونکہ اوروں میں نہیں ہے اسلئے اسلام کا رکن صرف ان ہی کو قرار دیا گیا ہے' اور خصوصیت و اہمیت وہی ہے جو پچھلے اوراق میں "حدیث جبرئیل" کی تشریح کے ضمن میں لکھی جا چکی ہے، جسکا حاصل یہ ہے کہ یہ "ارکان خمسہ" اسلام کیلئے بمنزلہ پیکر محسوس کے ہیں، نیز یہی وہ خاص تعبدی امور ہیں جو بالذات مطلوب و مقصود ہیں' اور ان کی فرضیت کسی عارض کی وجہ سے' اور کسی خاص حالت سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل اور دوامی فرائض ہیں، بخلاف جہاد اور امر بالمعروف کے، کہ اُن کی یہ حیثیت نہیں ہے اور وہ خاص حالات میں اور خاص موقعوں پر فرض ہوتے ہیں۔

ارکانِ اسلام پر جنت کی بشارت!

۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ نُهِيْنَا اَنْ نَسْأَلَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ شَيْئٍ فَكَانَ يُعْجِبُنَا اَنْ يَجِيَّ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ فَيَسْئَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! اَتَا نَا رَسُوْلُكَ فَزَعَمَ لَنَا اَنَّكَ تَزْعُمُ اَنَّ اللهَ اَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ' قَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ اللهُ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ قَالَ اللهُ قَالَ فَمَنْ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ وَجَعَلَ فِيْهَا مَا جَعَلَ قَالَ اللهُ قَالَ فَبِالَّذِىْ خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْاَرْضَ وَ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ اللهُ اَرْسَلَكَ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ يَوْمِنَا وَلَيْلَتِنَا قَالَ صَدَقَ' قَالَ فَبِالَّذِىْ اَرْسَلَكَ اللهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا زَكٰوةً فِيْ اَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِىْ اَرْسَلَكَ اللهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرِ رَمَضَانَ فِيْ سَنَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِىْ اَرْسَلَكَ اللهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا حَجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقَ' قَالَ ثُمَّ وَلّٰى وَقَالَ وَالَّذِىْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِنَّ وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُنَّ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَئِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ۔

(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم کو ممانعت کر دی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ سے (بلا خاص ضرورت کے) کچھ پوچھیں' تو ہم کو اس بات سے خوشی ہوتی تھی کہ کوئی سمجھدار بدوی حضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ سے کچھ پوچھے' اور ہم سنیں۔ تو ان ہی ایام میں ایک بدوی

خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "اے محمدؐ! تمہارا قاصد (یا مُبلغ) ہمارے پاس پہنچا تھا اُس نے ہم سے بیان کیا کہ تمہارا کہنا ہے کہ اللہ نے تم کو اپنا رسُول بنا کر بھیجا ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "اُسنے تم سے ٹھیک کہا۔" اُسکے بعد اُس بدوی نے کہا: "تو بتلاؤ کہ آسمان کس نے بنایا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اللہ نے!" اُس نے کہا: "زمین کس نے بنائی؟ آپؐ نے فرمایا اللہ نے۔ اس نے کہا زمین پر یہ پہاڑ کس نے کھڑے کئے ہیں اور ان پہاڑوں میں اور جو کچھ بنا ہے وہ کس نے بنایا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اللہ نے!" اُس کے بعد اُس بدوی سائل نے آپؐ سے کہا: "پس قسم ہے اُس ذات کی جس نے آسمان بنایا، زمین بنائی اور اس پر پہاڑ نصب کئے، کیا اللہ ہی نے تم کو بھیجا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "بیشک مجھے اللہ ہی نے بھیجا ہے۔" پھر اُس نے کہا: "تمہارے اُس قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا تھا، کہ ہم پر دن رات میں پانچ نمازیں بھی فرض ہیں؟" حضورؐ نے فرمایا: "یہ بھی اُس نے تم سے ٹھیک کہا!" اُس بدوی نے کہا: "تو قسم ہے آپ کے بھیجنے والے کی، کیا اللہ نے ہی آپ کو ان نمازوں کا بھی حکم کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں! یہ اللہ ہی کا حکم ہے!" پھر بدوی نے کہا: "اور آپ کے قاصد نے بیان کیا تھا کہ ہمارے مالوں میں زکوۃ بھی مقرر کی گئی ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ بھی اُس نے تم سے سچ کہا!" اعرابی نے کہا: "تو قسم ہے آپ کو بھیجنے والے کی، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا حکم ہے!" پھر اُس اعرابی نے کہا، کہ: "آپؐ کے قاصد نے بیان کیا تھا کہ سال میں ماہِ رمضان کے روزے بھی ہم پر فرض ہوئے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ بھی اُس نے سچ کہا۔" اعرابی نے عرض کیا: "تو قسم ہے آپ کے بھیجنے والے کی، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا حکم ہے!" اُس کے بعد اعرابی نے کہا: "اور آپؐ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا، کہ ہم میں سے جو حج کے لئے مکہ پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو اُس پر بیت اللہ کا حج بھی فرض ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ بھی اُس نے سچ کہا۔" (راوی کا بیان ہے، کہ) یہ سوال و جواب ختم کر کے وہ اعرابی چل دیا، اور چلتے ہوئے اُس نے کہا: "اُس ذات کی قسم! جس نے آپ (ﷺ) کو حق کیساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں ان میں نہ کوئی زیادتی کروں گا اور نہ کوئی کمی۔" رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: "اگر یہ صادق ہے، تو ضرور جنت میں جائیگا"۔

تشریح..... شروع حدیث میں "[illegible]" کا جو ذکر آیا ہے، اُسکا اشارہ قرآن پاک کی آیت: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ" کیطرف ہے، بات یہ ہے کہ نئے نئے سوالات کرنا انسان کی فطرت ہے، لیکن اس عادت کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبائع کا رجحان موشگافیوں ہی کی طرف زیادہ بڑھ جاتا ہے اور ان میں باتوں کی کھود کرید زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، اور عمل اسی نسبت سے کم، نیز اس میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور بالخصوص پیغمبرِ وقت سے زیادہ سوال کرنے میں ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ اُس کی جانب سے جواب ملنے کے بعد اُمت کی پابندیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، غرض ان ہی وجوہ سے غیر ضروری سوالات کرنے کی صحابہ کرامؓ کو بھی ممانعت فرمادی گئی تھی جسکے بعد وہ بہت ہی کم سوال کرتے تھے، اور اسکے آرزو مند رہا کرتے تھے، کہ کوئی بدوی آئے اور وہ آپ سے کچھ پوچھے، تو ہم کو بھی کچھ

سننے کو مل جائے، کیونکہ بیچارے بدویوں کیلئے حضور ﷺ کے یہاں بڑی وسعت تھی، اور اسی حدیث کی ایک روایت میں حضرت انسؓ ہی کی یہ تصریح بھی اس بارے میں مروی ہے کہ "بدوی آپکے یہاں سوالات میں بڑے جری تھے، اور جو چاہتے تھے بے دھڑک پوچھتے تھے"۔

صحیح بخاری کی اسی حدیث کی روایت میں ہے کہ آخر میں چلتے ہوئے سائل نے یہ بھی بتلایا کہ میں قبیلۂ بنی سعد بن بکر کا ایک فرد ہوں میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے، اور میں اپنی قوم کی طرف سے نمائندہ ہو کر آیا ہوں۔

نیز بخاری ہی کی روایت میں ہے کہ انہوں نے آکر پہلے ہی آنحضرت ﷺ سے عرض کر دیا تھا کہ:

اِنِّیْ سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِی الْمَسْئَلَةِ فَلا تَجِدْ عَلَیَّ فِیْ نَفْسِكَ فَقَالَ سَلْ عَمَّا بَدَالَكَ

میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں، مگر سوال میں میرا رویہ سخت ہوگا تو آپ ﷺ مجھ پر خفا نہ ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ "پوچھو جو تمہارے جی میں آئے۔"

اس کے بعد وہ سوال و جواب ہوئے جو حدیث میں مذکور ہوئے۔ اس سائل نے چلتے ہوئے آخر میں قسم کھا کر جو یہ کہا کہ:

لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِنَّ وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُنَّ کہ میں ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا

تو غالبًا اس سے اُس کا مطلب یہی تھا کہ میں آپ کی اس تعلیم و ہدایت کا پورا پورا اتباع کروں گا اور اپنی طبیعت اور اپنے جی سے اُس میں کوئی زیادتی کمی نہیں کروں گا، اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا یہ پیغام جوں کا توں ہی اپنی قوم کو پہنچاؤں گا، اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا۔

دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی قوم میں پہنچ کر بڑے جوش اور سرگرمی کے ساتھ تبلیغ شروع کی، بُت پرستی کے خلاف اتنی کھل کر تقریریں کیں کہ اُن کے بعض عزیزوں نے ان سے کہا کہ:

يَا ضِمَامُ اِتَّقِ الْبَرَصَ وَالْجُذَامَ اِتَّقِ الْجُنُوْنَ

اے ضمامؓ! برص، کوڑھ اور جنون سے ڈر (دیوتاؤں کی مخالفت سے کہیں تو کوڑھی اور دیوانا نہ بن جائے)

مگر اللہ پاک نے ان کی تبلیغ میں اتنی برکت دی کہ صبح کو جو لوگ ضمام کو کوڑھ اور دماغ کی خرابی سے ڈرا رہے تھے شام کو وہ بھی بُت پرستی سے بیزار اور توحید کے حلقہ بگوش ہو گئے، اور سارے قبیلے میں ایک متنفس بھی غیر مؤمن نہیں رہا۔ فرضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اجمعین

۵) عَنْ اَبِیْ اَيُّوْبَ اَنَّ اَعْرَابِيًا عَرَضَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِیْ سَفَرٍ فَاَخَذَ بِخِطَامِ نَاقَتِهٖ (اَوْبِزِمَامِهَا) ثُمَّ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (اَوْيَامُحَمَّد) اَخْبِرْنِیْ بِمَا يُقَرِّبُنِیْ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَكَفَّ النَّبِیُّ ﷺ ثُمَّ نَظَرَ فِیْ اَصْحَابِهٖ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ وُفِّقَ (اَوْ لَقَدْ هُدِیَ) قَالَ كَيْفَ قُلْتَ؟ فَاَعَادَ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِی الزَّكٰوةَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ دَعِ النَّاقَةَ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ایوبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے، کہ ایک بدوی سامنے آکھڑا ہوا، اور اُس

نے آپ کے ناقہ کی مُہار پکڑلی پھر کہااے اللہ کے رسول! (یا آپ کا نام لے کر کہا کہ اے محمد!) مجھے وہ بات بتاؤ جو جنت سے مجھے قریب اور آتش دوزخ سے دور کر دے؟ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ رُک گئے (یعنی آپ نے اس سوال کا جواب دینے کیلئے اپنی ناقہ کو روک لیا) پھر اپنے رفقاء کی طرف آپ نے دیکھا اور (اُن کو متوجہ کرتے ہوئے) فرمایا کہ اس کو اچھی توفیق ملی (یا فرمایا کہ اس کو خوب ہدایت ملی) پھر آپ نے اس اعرابی سائل سے فرمایا کہ "ہاں! ذرا پھر کہنا تم نے کس طرح کہا؟ سائل نے اپنا وہی سوال پھر دُہرایا (مجھے وہ بات بتادو، جو جنت سے مجھے نزدیک اور دوزخ سے دور کردے) حضور نے فرمایا "عبادت اور بندگی کرتے رہو صرف اللہ کی اور کسی چیز کو اُس کے ساتھ کسی طرح بھی شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور صلۂ رحمی کرو۔ (یعنی اپنے اہل قرابت کے ساتھ حسب مراتب اچھا سلوک رکھو، اور اُنکے حقوق ادا کرو) یہ بات ختم فرما کر حضرت نے اُس بدوی سے فرمایا کہ "اب ہماری ناقہ کی مُہار چھوڑ دو۔"

...... اس حدیث میں رسول اللہ نے جنت سے قریب اور جہنم سے بعید کرنے والے اعمال میں سے صرف اللہ کی خالص عبادت، اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ اور صلۂ رحمی ہی کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ روزہ اور حج کا بھی ذکر نہیں کیا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی کے لئے بس یہی چار باتیں کافی ہیں، اور ان کے علاوہ جو فرائض و واجبات ہیں وہ غیر ضروری یا غیر اہم ہیں۔ ایسا سمجھنا اور احادیث میں اس قسم کی موشگافیاں پیدا کرنا فی الحقیقت سلامت فہم اور خوش مذاقی سے بہت دور ہے۔ حدیث کے طالبعلم کو یہ اصول ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ رسول اللہ امت کیلئے ایک شفیق معلم اور مشفق مربی ہیں آپ کوئی مصنف اور مؤلف نہیں ہیں۔ اور شفیق معلم کا طریقہ یہی ہوتا ہے اور یہی اُس کیلئے صحیح بھی ہے کہ وہ جس موقع پر جس بات کی تلقین و تعلیم زیادہ مناسب سمجھتا ہے بس اُس وقت اُتنی ہی بات بتلاتا ہے۔ یہ طریقہ کا ہے کہ جہاں وہ جس موضوع پر کلام کرتے ہیں اُسکے تمام اطراف وجوانب اور مالہ وماعلیہ کو اُسی جگہ بیان کرتے ہیں کسی شفیق و معلم مربی کی تعلیم و تلقین میں بھی مصنفین وارباب فنون کا یہی طرز بیان تلاش کرنا در حقیقت خود اپنی بدذوقی ہے۔ پس روزہ، حج اور جہاد وغیرہ کا اس حدیث میں جو ذکر نہیں ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ اُس وقت اس سائل کو ان ہی چار باتوں کی تذکیر و ترغیب کی خاص ضرورت تھی، اور شاید اسکا سبب یہ ہو کہ عموماً ان ہی چار چیزوں میں لوگوں سے کوتاہی زیادہ ہوتی ہے، یعنی اقامت صلوٰۃ ادائے زکوٰۃ اور صلۂ رحمی میں غفلت و کوتاہی اور اللہ کے ساتھ شرک کا خطرہ دوسری قسم کی کوتاہیوں سے زیادہ رہتا ہے۔ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ روزہ اور حج جن پر فرض ہے اُن میں اُن کے تارک اتنے نہیں ہیں جتنے نماز و زکوٰۃ اور صلۂ رحمی وغیرہ حقوق العباد کی ادائیگی میں غفلت کرنے والے ہیں یا جو کسی قسم کے جلی یا خفی شرک میں ملوث ہیں۔ ایسے آدمی تو شائد تلاش کرنے سے بھی نہ مل سکیں جو نماز و زکوٰۃ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تو کماحقہ پابند ہوں لیکن روزہ اور حج باوجود فرضیت کے ادا نہ کرتے ہوں، لیکن آپ ایسوں کو گن بھی نہیں سکتے جو رمضان آنے پر روزے تو رکھ لیتے ہیں، مگر نماز کے پابند نہیں، یا اگرچہ حج تو اُنہوں نے کرلیا ہے لیکن زکوٰۃ اور صلۂ رحم جیسے حقوق عباد

کے معاملے میں وہ سخت کوتاہ کار ہیں۔ الغرض بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے آنحضرت نے اُس وقت صرف ان ہی چار باتوں کی تلقین پر اکتفا فرمایا ہو۔ واللہ اعلم۔

صحیح مسلم ہی کی اسی حدیث کی دوسری روایت کے آخر میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ جب وہ اعرابی چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر یہ مضبوطی سے ان احکام پر عمل کرتا رہا تو یقیناً جنت میں جائے گا۔"

اس حدیث کی روایت میں تین جگہ راوی نے اپنے شک کو ظاہر کیا ہے:

۱۔ ایک یہ کہ ناقہ کی مہار کے لئے اُوپر کے راوی نے کا لفظ بولا تھا یا کا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ سائل نے آنحضرت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا یا ۔

۳۔ تیسرے یہ کہ حضور نے اُس کی بابت صحابہؓ سے کہا تھا یا ۔

راوی کے اس اظہارِ شک سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے راویانِ حدیث نقل حدیث و روایت میں کس درجہ محتاط اور خدا ترس تھے، کہ تین جگہ صرف لفظوں میں اُن کو شک ہے کہ اُوپر کے راوی نے یہ لفظ بولا تھا یا یہ لفظ، تو اپنے اس شک کو بھی ظاہر کر دیا، حالانکہ تینوں جگہ معنیٰ میں خفیف سی کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوتی تھی۔

ف...... اس حدیث سے آنحضرت کی شفقتِ پیغمبرانہ کا بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ آپ سفر میں ہیں، ناقہ پر سوار چلے جا رہے ہیں (اور ظاہر ہے کہ آپ کا سفر یقیناً کسی دینی مہم ہی کے سلسلے کا سفر ہو گا) اثناء راہ میں ایک بالکل ناآشنا بدوی سامنے آ کر ناقہ کی مُہار پکڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ "مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دُور کرنے والی بات بتلاؤ۔" آپ اُس کے اس طرزِ عمل سے ناراض نہیں ہوتے، بلکہ اُس کی دینی حرص کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اور اپنے رفقاءِ سفر کو متوجہ کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس کو اچھی توفیق ملی"۔ پھر اپنے ان رفیقوں کو بھی سائل کی زبان ہی سے اس کا سوال سُنوانے کے لئے اُس سے فرماتے ہیں۔ "ذرا پھر کہو، تم نے کیسے کہا؟" اس کے بعد جواب دیتے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں (اچھا اب ہماری ناقہ کی مُہار چھوڑ دو) اللہ اکبر! پیغمبری کیا ہے، شفقت و رحمت کا ایک مجسم پیکر ہے۔ مگر یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ سائل ایک تھا۔ ع "موسیا آداب دانا دیگر اند"

۲۶۔ عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّاسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَاِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُ هُنَّ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَلَهٗ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ.

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ایک شخص جو علاقہ نجد کا رہنے والا تھا، اور اُسکے سر

کے بال بکھرے ہوئے تھے (کچھ کہتا ہوا) رسول اللہ ﷺ کی طرف کو آیا، ہم اُسکی بھنبھناہٹ (گونج) تو سنتے تھے مگر (آواز صاف نہ ہونے کی وجہ سے اور شاید فاصلے کی زیادتی بھی اسکی وجہ ہو) ہم اُسکی بات کو سمجھ نہیں رہے تھے، یہانتک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب آ گیا، اب وہ سوال کرتا ہے اسلام کے بارے میں (یعنی اُس نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ "مجھے اسلام کے وہ خاص احکام بتلایئے جن پر عمل کرنا بحیثیت مسلمان کے میرے لئے اور ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے") آپ ﷺ نے فرمایا "پانچ تو نمازیں ہیں دن رات میں (جو فرض کی گئی ہیں اور اسلام میں یہ سب سے اہم اور اول فریضہ ہے") اُس نے عرض کیا کہ "کیا انکے علاوہ اور کوئی نماز بھی میرے لئے لازم ہوگی؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! (فرض تو بس یہی پانچ نمازیں ہیں) مگر تمہیں حق ہےکہ اپنی طرف سے اور اپنے دل کی خوشی سے (ان پانچ فرضوں کے علاوہ) اور بھی زائد نمازیں پڑھو (اور مزید ثواب حاصل کرو۔)" پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اور سال میں پورے مہینے رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں (اور یہ اسلام کا دوسرا عمومی فریضہ ہے)"۔ اُس نے عرض کیا "کیا رمضان کے علاوہ کوئی اور روزہ بھی میرے لئے لازم ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! (فرض تو بس رمضان ہی کے روزے ہیں) مگر تمہیں حق ہے کہ اپنے دل کی خوشی سے تم اور نفلی روزے رکھو (اور اللہ تعالیٰ کا مزید قرب اور ثواب حاصل کرو)۔" راوی کہتے ہیں کہ اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُس شخص سے فریضۂ زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمایا، اُس پر بھی اُس نے یہی کہا، کہ "کیا زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور صدقہ ادا کرنا بھی میرے لئے ضروری ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! (فرض تو بس زکوٰۃ ہی ہے) مگر تمہیں حق ہے کہ اپنے دل کی خوشی سے تم نفلی صدقے دو (اور مزید ثواب حاصل کرو)۔" راوی حدیث طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ اسکے بعد وہ سوال کرنے والا شخص واپس لوٹ گیا اور وہ کہتا جا رہا تھا کہ (مجھے جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے بتلایا ہے) میں اس میں (اپنی طرف سے) کوئی زیادتی کمی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے (اُس کی یہ بات سن کر) فرمایا "فلاح پا لی اس نے اگر یہ سچا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح..... اس حدیث میں بھی ارکان اسلام میں سے آخری رکن "حج" کا ذکر نہیں ہے، اسکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ حج فرض ہونے سے پہلے کا ہو، حج کی فرضیت کا حکم بنا بر قول مشہور ۸ھ یا ۹ھ میں آیا ہے، پس ممکن ہے کہ یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہو۔

اور دوسری بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو اس موقعہ پر حج کا اور اسلام کے دوسرے اہم احکام کا بھی ذکر فرمایا ہو، مگر روایت کے وقت صحابیؓ نے اختصار کر دیا ہو، اور واقعہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اسی حدیث کی صحیح بخاری کی ایک روایت میں نماز، اور زکوٰۃ کے ذکر کے بعد راوی حدیث طلحہ بن عبید اللہؓ کی طرف سے یہ الفاظ بھی روایت کئے گئے ہیں کہ "فاخبرہ عن شرائع الاسلام" رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو اسلام کے احکام بتلائے۔)

ارکان اسلام کی دعوت میں ترتیب و تدریج

۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِمَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ حِيْنَ بَعَثَهُ اِلَى الْيَمَنِ اِنَّكَ سَتَاْتِيْ قَوْمًا

مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ فَاِذَا جِئْتَهُمْ فَادْعُهُمْ اِلَى اَنْ يَّشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لَكَ بِذَالِكَ فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْكُمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لَكَ بِذَالِكَ فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْكُمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدَّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لَكَ بِذَالِكَ فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ. (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا، تو (رخصت کرتے ہوئے) اُن سے فرمایا: "تم وہاں اہلِ کتاب میں سے ایک قوم کے پاس پہنچو گے، پس جب تم اُن کے پاس جاؤ، تو (سب سے پہلے) اُن کو اس کی دعوت دینا، کہ وہ شہادت دیں (یعنی دل وزبان سے قبول کریں) کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں، اور یہ شہادت ادا کریں، تو پھر تم اُن کو بتلانا، کہ اللہ نے دن رات میں تم پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں؟ پھر جب وہ اس میں بھی تمہاری اطاعت کریں، تو اس کے بعد تم اُن کو بتلانا، کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے، جو قوم کے مالداروں سے لی جائے گی، اور اسی کے فقراء و مساکین کو دے دی جائے گی، پھر اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں، تو پھر (زکوٰۃ وصول کرتے وقت چھانٹ چھانٹ کے) ان کے نفیس نفیس اموال نہ لینا، اور مظلوم کی بد دُعا سے بہت بچنا، کیونکہ اُسکے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح......امام بخاری وغیرہ بعض علماء کی تحقیق کے مطابق ۱۰ھ میں، اور اکثر علماءِ سیر واہلِ مغازی کے نزدیک ۹ھ میں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا، اور رخصت کرتے وقت، اہلِ یمن کو اسلام کی دعوت دینے کے متعلق آپ نے ان کو یہ ہدایات دی تھیں...... بعض لوگوں کو اس حدیث میں بھی یہ اشکال ہوا ہے کہ اس میں حضور ﷺ نے صرف نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا، حالانکہ اُس وقت روزہ اور حج کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔ شارحین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں، اس ناچیز کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ قرین قیاس توجیہ یہ ہے کہ حضرت معاذ کو آپ ﷺ نے جو یہ ہدایت دی، اس سے آپ کا مقصد اسلام کے ان تمام احکام و فرائض کو بتلانا نہ تھا جو اسلام لانے کے بعد ایک مسلمان پر عائد ہوتے ہیں، بلکہ آپ کا مقصد و مطلب صرف یہ تھا کہ دین کی دعوت اور اسلام کی تعلیم میں داعی اور معلّم کو جو ترتیب اور تدریج اختیار کرنی چاہئے وہ حضرت معاذؓ کو بتلا دیں، اور وہ یہ ہے کہ ایک دم سارے اسلامی احکام و مطالبات اور شریعت کے تمام اوامر ونواہی لوگوں کے سامنے نہ رکھے جائیں، اس صورت میں اسلام کو قبول کرنا اُن کے لئے بڑا مشکل ہوگا، بلکہ سب سے پہلے اُن کے سامنے توحید ورسالت کو پیش کیا جائے، جب وہ اس کو مان لیں، تو انہیں بتلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو ہمارا اور تمہارا واحد رب اور لاشریک مالک و مولیٰ ہے، اس نے ہم سب پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے، پھر جب وہ اس کو مان لیں، تو ان کو بتلایا جائے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں میں زکوٰۃ بھی فرض کی ہے، جو قوم کے مالداروں سے وصول کی

جائے گی اور اُس کے حاجت مند طبقہ میں تقسیم کر دی جائے گی۔

بہر حال حضرت معاذؓ کو یہ ہدایت دینے سے حضور ﷺ کا مقصد دعوت و تعلیم میں ترتیب و تدریج کا حکیمانہ اصول ان کو بتلانا تھا، باقی اسلام کے ضروری احکام اور ارکان حضرت معاذؓ کو معلوم ہی تھے، اس لئے اس موقع پر سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

علاوہ ازیں اس میں بھی شبہ نہیں، کہ اسلام کے ارکان و فرائض میں نماز اور زکوٰۃ ہی سب سے زیادہ اہم ہیں، اور قرآن مجید میں انہی دو پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ جو شخص ان دو کو ادا کرنے لگے، اُس کیلئے باقی تمام ارکان و فرائض کا ادا کرنا آسان ہو جاتا ہے، جیسا کہ تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے، نیز نفسِ انسانی کی طبیعت میں ان دونوں کو بہت خاص دخل ہے۔ اور غالباً اسی واسطے کتاب و سنت میں بہت سے مقامات پر صرف ان ہی دو رکنوں کا ذکر کیا جاتا ہے........ مثلاً سُورۂ بیّنہ میں فرمایا گیا:۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ... اور سُورۂ توبہ میں فرمایا گیا:۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ...... اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث آگے آنے والی ہے:۔ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ... پس ان آیات واحادیث میں ارکانِ اسلام میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کے ذکر کی ایک توجیہ یہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اسلام کی دعوت و تعلیم کے متعلق یہ ہدایت دینے کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو ایک نصیحت فرمائی، کہ جب زکوٰۃ کی وصولی کا وقت آئے، تو ایسا نہ کیا جائے کہ لوگوں کے اموال (مثلاً پیداوار، اور چوپایوں) میں سے بہتر بہتر زکوٰۃ میں لینے کیلئے چھانٹ لئے جائیں، بلکہ جیسا مال ہو اسی کے اوسط سے زکوٰۃ وصول کی جائے۔

سب سے آخری نصیحت آپ نے یہ فرمائی کہ دیکھو! مظلوم کی بددُعا سے بچنا (مطلب یہ ہے کہ تم ایک علاقے کے حاکم بن کر جا رہے ہو، دیکھو کبھی کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرنا) کیونکہ مظلوم کی دُعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے، وہ قبول ہو کے رہتی ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

بلکہ مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے:۔

دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ مُسْتَجَابَةٌ وَاِنْ كَانَ فَاجِرًا فَفُجُوْرُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ

مظلوم کی دُعا قبول ہی ہوتی ہے، اگرچہ وہ بدکار بھی ہو، تو اسکی بدکاری کا وبال اسکی ذات پر ہے۔ (مسند احمد)

(یعنی فسق و فجور کے باوجود ظالم کے حق میں اُس کی بددُعا قبول ہوتی ہے)۔

اور مسند احمد ہی میں حضرت انسؓ کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:۔

دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ مُسْتَجَابَةٌ وَاِنْ كَانَ كَافِرًا لَيْسَ دُوْنَهُ حِجَابٌ

مظلوم کی بد دُعا قبول ہوتی ہے، اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اس کیلئے کوئی روک نہیں ہے۔ (احمد)

ف...... اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا، اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر چلنا اگلے پیغمبروں اور اگلی کتابوں کے ماننے والے اہل کتاب کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور اپنے سابقہ ادیان پر قائم رہنا اب اُن کی نجات کے لئے کافی نہیں۔ ہمارے اس زمانہ میں مسلمان کہلانے والوں میں سے بعض لکھے پڑھے جو اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ "یہود و نصاریٰ جیسی امتیں ان پرانی شریعتوں پر چل کر بھی اللہ کی رضا اور نجات حاصل کر سکتی ہیں اور ان کے لئے شریعتِ اسلام کا اتباع ضروری نہیں"۔ وہ یا تو دین اور اصولِ دین سے جاہل ہیں یا دراصل منافق ہیں، آئندہ حدیث میں یہی مسئلہ اور زیادہ صراحت اور وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔

اللہ کے رسولؐ پر جو شخص ایمان نہ لائے، اور اُن کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین نہ بنائے، وہ نجات نہیں پا سکتا!

۸) **عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ وَالَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِىْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِىٌّ وَلَا نَصْرَانِىٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِىْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ.** (رواہ مسلم)

ترجمہ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "قسم اُس ذاتِ پاک کی، جسکے قبضہ ٔ قدرت میں محمد کی جان ہے، اس اُمت کا (یعنی اس دور کا) جو کوئی بھی یہودی یا نصرانی میری خبر سُن لے (یعنی میری نبوت و رسالت کی دعوت اُس تک پہنچ جائے) اور پھر وہ مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے، تو ضرور وہ دوزخیوں میں ہوگا"۔ (رواہ مسلم)

تشریح...... اس حدیث میں یہودی اور نصرانی کا ذکر صرف تمثیل کے طور پر اور یہ ظاہر کرنے کے واسطے کیا گیا ہے کہ جب یہود و نصاریٰ جیسے مُسلّم اہل کتاب بھی خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائے بغیر اور ان کی شریعت کو قبول کئے بغیر نجات نہیں پا سکے، تو دوسرے کافروں، مشرکوں کا انجام اسی سے سمجھ لیا جائے۔

بہر حال حدیث کا مضمون عام ہے، اور مطلب یہ ہے، کہ اس دورِ محمدی میں (جو حضور ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا) جس شخص کو آپ کی نبوت و رسالت کی دعوت پہنچ جائے، اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے، اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین نہ بنائے، اور اسی حال میں مر جائے، تو وہ دوزخ میں جائے گا، اگرچہ وہ کسی سابق پیغمبر کے دین اور اُس کی کتاب و شریعت کا ماننے والا کوئی یہودی یا نصرانی ہی کیوں نہ ہو، الغرض خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے اور آپ کی شریعت کو قبول کئے بغیر نجات ممکن نہیں، ہاں جس بیچارہ کو آپ کی نبوت کی اطلاع اور اسلام کی دعوت ہی نہ پہنچی وہ معذور ہے۔ یہ مسئلہ دینِ اسلام کے قطعیات اور بدیہیات میں سے ہے جس میں شک و شبہ رسول اللہ ﷺ کی

نبوت و رسالت کی حیثیت کو نہ سمجھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

٩) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ اَرَأَيْتَ رَجُلًا مِنَ النَّصَارٰى مُتَمَسِّكًا بِالْاِنْجِيْلِ وَرَجُلًامِنَ الْيَهُوْدِ مُتَمَسِّكًا بِالتَّوْرَاةِ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَتَّبِعْكَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ سَمِعَ بِىْ مِنْ يَهُوْدِيٍ اَوْ نَصْرَانِيٍ ثُمَّ لَمْ يَتَّبِعْنِىْ فَهُوَفِى النَّارِ.

(اخرجه[1] الدار قطنى فى الافراد)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ انہوں نے بیان کیا، کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اسنے سوال کیا، کہ "یارسول اللہ! ایک نصرانی شخص ہے جو انجیل کے موافق عمل کرتا ہے، اور اسی طرح ایک یہودی شخص ہے، جو تورات کے احکام پر چلتا ہے، اور وہ اللہ پر اسکے رسول پر ایمان بھی رکھتا ہے، مگر اسکے باوجود وہ آپ کے دین اور آپ کی شریعت پر نہیں چلتا، تو فرمائیے کہ اس کا کیا حکم ہے؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس یہودی یا نصرانی نے میری بات کو سُن لیا (یعنی میری دعوت اُس تک پہنچ گئی) اور اسکے بعد بھی اسنے میری پیروی اختیار نہیں کی، تو وہ دوزخ میں جانے والا ہے۔" (دار قطنی)

تشریح..... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ والی اوپر کی حدیث سے بھی زیادہ واضح ہے، اس میں تصریح ہے کہ اگر کوئی یہودی یا نصرانی اللہ کو اور اُسکے رسول کو مانتا بھی ہو (یعنی توحید کا قائل، اور رسول اللہ ﷺ کی بھی تصدیق کرتا ہو) مگر پیروی آپ کی لائی ہوئی شریعت کے بجائے تورات اور انجیل ہی کی کرتا ہو، اور اسی کو اپنی نجات کے لئے کافی سمجھتا ہو، تو وہ نجات نہیں پاسکے گا"۔

اسی حقیقت کا اعلان قرآن مجید کی اس آیت میں بھی کیا گیا ہے:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ". (آل عمران ٣: ٣١)

اے نبی (جو لوگ آپ کی شریعت کا اتباع اختیار کئے بغیر اللہ کو چاہتے ہیں، اور اُسکی بخشش حاصل کر سکنے کی خام خیالی میں مبتلا ہیں، اُن سے) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم واقعۃً اللہ کو چاہتے ہو، تو (اسکے سوا اب اُس کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ) میری شریعت کی پیروی اختیار کرو (اگر ایسا کروگے، تو) اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ (اور اگر تم میری پیروی اختیار نہیں کروگے، تو اللہ کی محبت اور مغفرت کے تم مستحق نہیں ہو سکوگے)۔

سچا ایمان و اسلام نجات کی ضمانت ہے

١٠) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَوْعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ (شَكَّ الْاَعْمَشُ) قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ لَوْاَذِنْتَ لَنَا فَنَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا فَاَكَلْنَا وَادَّهَنَّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ

[1] یہ حدیث مولانا بدرِ عالم صاحب نے "ترجمان السنۃ" جلد دوم میں نقل فرمائی ہے، اس ناچیز نے نظر ثانی کے وقت وہیں سے اس کا اضافہ کیا ہے۔

(ﷺ) اِفْعَلُوْا، قَالَ فَجَاءَ عُمَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنْ فَعَلْتَ قَلَّ الظَّهَرُ وَلٰكِنِ ادْعُهُمْ بِفَضْلِ اَزْوَادِهِمْ ثُمَّ ادْعُ اللهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ لَعَلَّ اللهُ اَنْ يَّجْعَلَ فِيْ ذَالِكَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) نَعَمْ فَدَعَا بِنِطْعٍ فَبُسِطَ ثُمَّ دَعٰى بِفَضْلِ اَزْوَادِهِمْ قَالَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيْئُى بِكَفِّ ذُرَّةٍ قَالَ وَجَعَلَ وَيَجِيْئُى الْاٰخَرُ بِكَفِّ تَمَرٍ قَالَ وَيُجِيْئُى الْاٰخَرُ بِكِسْرَةٍ حَتّٰى اجْتَمَعَ عَلَى النِّطْعِ مِنْ ذَالِكَ شَيْئٌ يَّسِيْرٌ قَالَ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللهِ(ﷺ) بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ قَالَ خُذُوْا فِيْ اَوْعِيَتِكُمْ قَالَ فَاَخَذُوْا فِيْ اَوْعِيَتِهِمْ حَتّٰى مَاتَرَكُوْا فِي الْعَسْكَرِ وِعَاءً اِلَّامَلَئُوْهُ قَالَ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا وَفَضَلَتْ فَضْلَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ، لَا يَلْقَى اللهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرُ شَاكٍّ فَيُحْجَبُ عَنِ الْجَنَّةِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ (اعمش تابعی نے اپنے استاذ ابو صالح سے اس شک کے ساتھ نقل کیا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا تھا، یا (ابو سعید خدریؓ سے) کہ غزوۂ تبوک کے دنوں میں (جب سامانِ خوراک ختم ہو گیا، اور) لوگوں کو بھوک نے ستایا، تو انہوں نے رسول اللہ (ﷺ) سے عرض کیا، کہ: "حضرت! اگر اجازت دیں، تو ہم پانی لانے والے اپنے اونٹوں کو ذبح کرلیں، پھر انکو کھا بھی لیں، اور ان سے روغن بھی حاصل کرلیں"۔ حضور نے فرمایا: "اچھا کرلو!"۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمرؓ آئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ نے ایسا کیا (یعنی لوگوں کو اگر اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دیدی، اور لوگوں نے ذبح کر ڈالے) تو سواریاں کم ہو جائیں گی (لہذا ایسا تو نہ کیا جانے) البتہ لوگوں کو آپ ان کے بچے کچھے سامانِ خوراک کے ساتھ بلالیجئے، پھر ان کے واسطے اللہ سے اسی میں برکت کر دینے کی دُعا کیجئے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی میں برکت فرمادے گا"۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا: "ہاں ٹھیک ہے"۔ چنانچہ آپ نے چمڑے کا بڑا دستر خوان طلب فرمایا، پس وہ بچھا دیا گیا، پھر آپ نے لوگوں سے اُن کا بچا کھچا سامانِ خوراک منگوایا، پس کوئی آدمی مٹھی چینا کے دانے ہی لئے آرہا ہے، کوئی ایک مٹھی کھجوریں لارہا ہے، اور کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی لئے چلا آرہا ہے، حتّٰی کہ دستر خوان پر تھوڑی سی مقدار میں یہ چیزیں جمع ہو گئیں، راوی کہتے ہیں، کہ رسول للہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر برکت کی دُعا فرمائی، اس کے بعد فرمایا: اب تم سب اس میں سے اپنے اپنے برتنوں میں بھر لو"۔ چنانچہ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لئے، حتی کہ (قریباً ۳۰ ہزار کے لشکر میں) لوگوں نے ایک برتن بھی بغیر بھرے ہوئے نہیں چھوڑا، راوی کہتے ہیں، کہ پھر سب نے کھایا، حتی کہ خوب سیر ہو گئے، اور کچھ فاضل بھی بچ رہا، اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، نہیں ہے کوئی بندہ جو بغیر کسی شک شبہ کے کامل یقین واذعان کے ساتھ ان دو شہادتوں کے ساتھ اللہ کے سامنے جائے، پھر وہ جنت سے روکا جائے"۔

تشریح ...... حدیث کا مضمون ظاہر ہے، جس مقصد سے اس حدیث کو یہاں درج کیا گیا ہے اسکا تعلق حدیث کے صرف آخری جز سے ہے، جس میں رسول اللہ (ﷺ) نے اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کی شہادت ادا کر

کے اعلان فرمایا ہے کہ جو شخص بھی ان دو شہادتوں کو مخلصانہ طور پر ادا کرے، اور شک شبہ کی کوئی بیماری اُسکے دل دماغ کو نہ ہو، اور اسی ایمانی حال میں اُس کو موت آئے، تو وہ جنت میں ضرور جائے گا۔

جو لوگ قرآن و حدیث کے محاورہ اور طرز بیان سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں، کہ ایسے موقعوں پر "اللہ کی توحید اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی شہادت" ادا کرنے کا مطلب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت ایمان کو قبول کرلینا، اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کو اپنا دین بنالینا ہوتا ہے اور اسی لئے ان دو شہادتوں کے ادا کرنے کا مطلب ہمیشہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایمانی دعوت کو قبول کرلیا، اور اسلام کو اپنا دین بنالیا۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہی ہے، کہ جو شخص "لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ" کی شہادت ادا کر کے میری ایمانی دعوت کو قبول کرلے، اور اسلام کو اپنا دین بنالے، اور اس بارے میں وہ مخلص اور صاحب یقین ہو، تو اگر اسی حال میں وہ مر جائے گا، تو جنت میں ضرور جائے گا۔

پس اگر کوئی شخص "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا اقرار کرے لیکن اسلام کو اپنا دین نہ بنائے، بلکہ کسی اور دین و مذہب پر قائم رہے، یا توحید و رسالت کے علاوہ دوسرے ایمانیات کا انکار کرے مثلاً قیامت کو یا قرآن مجید کو نہ مانے تو وہ ہرگز اس بشارت کا مستحق نہ ہوگا۔

الغرض اس حدیث میں توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے کا مطلب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایمانی دعوت کو قبول کرنا اور اسلام کو اپنا دین بنانا ہے، اسی طرح جن حدیثوں میں صرف توحید پر، اور صرف "لا الٰہ الا اللہ" کے اقرار پر جنت کی بشارت دی گئی ہے، ان کا مطلب بھی یہی ہے، دراصل یہ سب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوتِ ایمان کو قبول کرلینے اور اسلام کو اپنا دین بنالینے کے بعد مشہور و معروف عنوانات ہیں، انشاءاللہ اس کی کچھ مزید تفصیل اگلی حدیثوں کی تشریح میں بھی کیجائیگی۔

اس حدیث سے ضمنی طور پر اور بھی چند سبق ملتے ہیں:

۱) اگر کوئی بڑا، حتی کہ اللہ کا نبی و رسول بھی کسی معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرے، اور کسی صاحب رائے خادم کو اس میں مضرت کا کوئی پہلو نظر آئے، تو وہ ادب کے ساتھ اپنی رائے اور اپنا مشورہ پیش کرنے سے دریغ نہ کرے، اور اس بڑے کو چاہئے کہ وہ اس پر غور کرے، اور اگر وہی رائے بہتر اور انسب معلوم ہو، تو اپنی رائے سے رجوع کرنے اور اُس کو اختیار کرنے میں ادنیٰ تامل نہ کرے۔

۲) دُعا کا قبول ہونا، اور بالخصوص اس قبولیت کا خرقِ عادت کی شکل میں ظاہر ہونا اللہ کی نشانیوں اور مقبولیت اور تعلق باللہ کی خاص علامتوں میں[1] سے ہے، جس سے مؤمنین کے انشراح صدر اور اطمینان قلبی میں

---

[1] واضح رہے کہ خوارق کا ظہور، تعلق باللہ اور مقبولیت عنداللہ کی نشانی جب ہے کہ صاحب واقعہ مؤمن اور صاحب صلاح و تقویٰ ہو، ورنہ اگر کسی کھلے کافر یا فاسق و فاجر یا کسی داعی ضلال سے ایسی کسی چیز کا ظہور ہو، تو وہ دینی اصطلاح میں "استدراج" ہے، اور "کرامت" اور "استدراج" میں یہی سہل الادراک اور ظاہری فرق ہے، اس ناچیز نے اپنی کتاب "دین و شریعت" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ۱۲

ترقی ہونا برحق بلکہ نبوت کی میراث ہے (جیسا کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے کلمۂ شہادت پڑھنے سے ظاہر ہے) پس جن لوگوں کو اس طرح کے انعامات الٰہیہ کے تذکرہ سے بجائے انشراح کے انقباض ہوتا ہے، یا جو اس قسم کے خوارق کو طنز و تضحیک اور استخفاف و استحقار کے لائق سمجھتے ہیں، اُن کے دل ایک بڑی بیماری کے بیمار ہیں۔

(۱۱) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ ارشاد فرماتے تھے کہ: "جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے، اور محمد اُسکے رسول ہیں، تو اللہ نے اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے"۔

تشریح ... جیسا کہ اس سے پہلی حدیث کی تشریح میں تفصیل سے بتلایا جا چکا ہے، اس حدیث میں بھی "توحید و رسالت کی شہادت" مراد، دعوت اسلام کو قبول کرنا اور اُس پر چلنا ہے، اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ: "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی شہادت پورے اسلام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جس نے یہ شہادت سوچ سمجھ کے ادا کی، درحقیقت اس نے پورے اسلام کو اپنا دین بنالیا، اب اگر بالفرض اس سے بہ تقاضائے بشریت کوئی کوتاہی بھی ہوگی تو اسکا ایمانی شعور، کفارہ اور توبہ وغیرہ کے مقررہ طریقوں سے اسکی تلافی کرنے پر اسکو مجبور کریگا، اور اسلئے انشاءاللہ وہ عذاب دوزخ سے محفوظ ہی رہے گا۔

(۱۲) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ اِلَّا مُؤْخَرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ فَقُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَامُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ هَلْ تَدْرِيْ مَاحَقُّ اللّٰهِ عَزَّوَ جَلَّ عَلَى الْعِبَادِ قَالَ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اِذَا فَعَلُوْا ذَالِكَ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اَنْ لَا يُعَذِّبَهُمْ. (رواہ البخاری و مسلم واللفظ لہ)

ترجمہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے، کہ ایک دفعہ میں حضور ﷺ کے ساتھ ایک ہی سواری پر تھا، اور میرے اور آپ ﷺ کے درمیان کجاوے کے پچھلے حصے کے سوا اور کوئی چیز حائل نہ تھی (یعنی میں حضور ﷺ کے پیچھے بالکل ملا ہوا بیٹھا تھا کہ چلتے ہی چلتے) آپ ﷺ نے مجھے پکارا، اور فرمایا: معاذ بن جبل! میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ (ﷺ) وسعدیک" (یعنی میں حاضر ہوں، ارشاد فرمائیں) ..... پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "معاذ بن جبل! میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ وسعدیک" پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "معاذ بن جبل!" میں نے عرض کیا "لبیک یا رسول اللہ وسعدیک"

(اس تیسری دفعہ میں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم جانتے ہو، کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟" میں نے عرض کیا: "اللہ ورسول ﷺ کو ہی زیادہ علم ہے" ارشاد فرمایا: "اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اسکی عبادت و بندگی کریں، اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں" پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "معاذ بن جبل!" میں نے عرض کیا "لبیک یارسول اللہ (ﷺ) وسعدیک" آپ ﷺ نے فرمایا: "تم جانتے ہو کہ جب بندے اللہ کا یہ حق ادا کریں، تو پھر اللہ پر ان کا کیا حق ہے؟" میں نے عرض کیا: "اللہ ورسول ﷺ ہی کو زیادہ علم ہے" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ انہیں عذاب میں نہ ڈالے"۔

تشریح..... اس حدیث میں چند چیزیں قابلِ توجہ ہیں:

۱) حضرت معاذؓ نے اصل حدیث بیان کرنے سے پہلے حضور ﷺ کیساتھ ایک ہی سواری پر سوار ہونے، اور آپکے پیچھے بالکل آپ سے مل کر بیٹھنے کو جس خاص انداز سے بیان کیا ہے، اس کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں:

ایک یہ کہ حضور ﷺ کی جو خاص شفقت اور عنایت حضرت معاذؓ پر تھی، اور بارگاہِ نبوی ﷺ میں جو خاص مقام قرب ان کو حاصل تھا، وہ سامعین کے پیشِ نظر رہے، تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ سے ایک ایسی بات کیوں فرمائی، جس کی عوام مسلمین میں اشاعت کے آپ روادار نہ تھے، جیسا کہ اگلی روایت میں تصریح ہے۔

دوسری بات اس کی توجیہ میں یہ بھی کہی جاسکتی ہے، کہ ممکن ہے حضرت معاذؓ کا مقصد اس تفصیل کے بیان کرنے سے اس حدیث کے بارے میں اپنا اتقان بھی ظاہر کرنا ہو، یعنی لوگوں پر یہ واضح کرنا ہو کہ مجھے یہ حدیث ایسی یاد ہے، کہ اُس وقت کی یہ جزئی باتیں بھی مجھے محفوظ ہیں۔

اور تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ جس طرح عشاق و محبین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ محبت کی یادگار صحبتوں کو والہانہ انداز میں اور مزے لے لے کر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اسی جذبے کے ماتحت حضرت معاذؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ اپنے سوار ہونے کی یہ تفصیل بیان کی ہو۔

۲) حضور ﷺ نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد حضرت معاذؓ کو تین دفعہ مخاطب کیا، اور پھر جو کچھ آپ فرمانا چاہتے تھے اُس کا ایک حصہ آپ نے تیسری دفعہ فرمایا، اور دوسرا جز کچھ دیر توقف کے بعد چوتھی دفعہ فرمایا..... اس کی توجیہ میں شارحین نے لکھا ہے، کہ غالباً آنحضرت ﷺ اس طرح حضرت معاذؓ کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ فرمانا چاہتے تھے، تاکہ وہ ہمہ تن گوش ہو کر پوری رغبت و توجہ اور غور و تامل کے ساتھ آپ کا ارشاد سنیں..... دوسری توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ حضورؐ کو اس میں تردد اور توقف تھا، کہ حضرت معاذؓ سے بھی یہ بات بیان کر دی جائے یا نہ کی جائے، اس وجہ سے آپ نے ابتداء میں تو تین دفعہ توقف فرمایا، اور جب بیان فرمادینے ہی کے متعلق آپ کا شرح صدر ہو گیا تب آپ نے بیان فرمایا..... لیکن راقم کے نزدیک ان دونوں توجیہوں میں تکلف ہے، اور زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے، کہ حضور ﷺ پر اس وقت کوئی خاص استغراقی حالت طاری تھی، آپ حضرت معاذؓ کو مخاطب کرتے تھے، اور کچھ فرمانے سے پہلے پھر اسی کیفیت میں استغراق ہو جاتا تھا، اس وجہ سے درمیان میں یہ

وقفے ہوئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳) اصل حدیث کا حاصل صرف یہ ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے، کہ وہ اس کی عبادت اور بندگی کریں، اور کسی چیز کو اسکے ساتھ شریک نہ کریں، اور جب وہ اللہ کا یہ حق ادا کرینگے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ حق اپنے پر مقرر کر لیا ہے کہ وہ انکو عذاب میں نہ ڈالے گا۔

اس حدیث میں "اللہ کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے" سے مُراد بھی در حقیقت دینِ توحید (یعنی اسلام) کو اختیار کرنا، اور اُس پر چلنا ہے، اور چونکہ اُس وقت اسلام و کفر کے درمیان سب سے بڑا اور واضح فرق و امتیاز توحید اور شرک ہی کا تھا، اسلئے اس حدیث میں (اور بعض، اور حدیثوں میں بھی) اسی عنوان کو اختیار کیا گیا ہے، نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ کی عبادت و بندگی کرنا، اور شرک سے بچنا اسلام کی رُوح، اور اُس کا مرکزی مسئلہ ہے، اسلئے بھی کبھی کبھی اسلام کے لئے یہ عنوان اختیار کر لیا جاتا ہے، اس بات کی تائید (کہ اس حدیث میں اللہ کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے سے مراد دینِ اسلام قبول کرنا ہے) اس سے بھی ہوتی ہے، کہ صحیحین (بخاری و مسلم) ہی میں حضرت معاذؓ کی اسی حدیث کی ایک روایت میں (جو اگلے ہی نمبر پر ذکر کی جارہی ہے) توحید و رسالت دونوں پر ایمان لانے اور دونوں کی شہادت ادا کرنے کا ذکر ہے، اور ایک روایت میں شہادت توحید و رسالت کے علاوہ نماز اور روزہ کا بھی ذکر ہے۔

۱۳) **عَنْ اَنَس اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ وَمَعَاذٌ رَدِیْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مَعَاذ! قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَ سَعْدَيْكَ، قَالَ يَا مَعَاذُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مَعَاذُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ ، ثَلَاثًا، قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّار ، قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوْا فَاَخْبَرَ بِهَا مَعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا.**

(رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ حضرت معاذؓ کو جبکہ وہ حضور کے ساتھ ایک ہی کجاوے پر سوار تھے، پکارا اور فرمایا: "یا معاذ!" انھوں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک"۔ حضور نے پکارا: "یا معاذ!" انھوں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک"۔ حضور نے پھر پکارا "یا معاذ!" انھوں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک"۔ تین دفعہ ایسا ہوا، پھر حضور نے (اس آخری دفعہ میں فرمایا) "جو کوئی سچے دل سے شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد اسکے رسول ہیں، تو اللہ نے دوزخ پر ایسے شخص کو حرام کر دیا ہے"۔ حضرت معاذؓ نے (یہ خوش خبری سن کر) عرض کیا: "کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کر دوں، تاکہ وہ سب خوش ہو جائیں؟"۔ حضور نے فرمایا: "پھر وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے"۔ پھر حضرت معاذؓ نے کتمانِ علم کے گناہ کے خوف سے اپنے آخری وقت میں یہ حدیث لوگوں سے بیان کی۔

تشریح...... ان دونوں روایتوں (۱۲ و ۱۳) کے ابتدائی تمہیدی حصے کی مطابقت و یکسانیت سے ظاہر ہے کہ ان

دونوں کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے، اور فرق صرف یہ ہے کہ پہلی روایت میں دعوتِ اسلام قبول کرنے کیلئے اللہ کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے کا عنوان استعمال کیا گیا ہے، اور دوسری میں اسی حقیقت کو توحید ورسالت کی شہادت کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اسی بشارت کی تیسری روایت میں حضرت معاذؓ نے توحید کے ساتھ نماز اور روزہ کا بھی ذکر کیا ہے، یہ روایت "مشکوٰۃ" میں "مسند احمد" کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں:

مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَ يُصَلِّي الْخَمْسَ وَ يَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَلَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا

جو شخص اللہ کے سامنے اس حال میں جائے گا، کہ شرک سے اُس کا دامن پاک ہو، اور وہ پانچوں نمازیں پڑھتا ہو، اور روزے رکھتا ہو تو وہ بخش ہی دیا جائے گا (معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: حضورؐ! اجازت ہو تو میں سبکو یہ بشارت سُنادوں؟ آپ نے فرمایا: "جانے دو، انہیں عمل کرنے دو!"

ان تینوں روایتوں کا عنوان اگرچہ مختلف ہے، اور ظاہری الفاظ میں اجمال و تفصیل کا کسی قدر فرق ہے۔ لیکن درحقیقت ہر روایت کا مطلب یہ ہی ہے کہ جو کوئی دعوتِ ایمان و اسلام کو قبول کرلے گا (جس کے بنیادی اصول و احکام، شرک سے بچنا، توحید و رسالت کی شہادت دینا، اور نماز پڑھنا، روزہ رکھنا) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نجات کا حتمی وعدہ ہے۔

پس جو لوگ اس قسم کی روایات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے اور شرک سے بچنے کے بعد آدمی خواہ کیسا ہی بد عقیدہ اور بد عمل کیوں نہ ہو، بہر حال وہ اللہ کے عذاب سے مامون و محفوظ ہی رہے گا، اور دوزخ کی آگ اس کو چھو ہی نہ سکے گی، وہ ان بشارتی حدیثوں کا صحیح مفہوم اور مدعا سمجھنے سے محروم ہیں، نیز دوسرے ابواب کی جو سینکڑوں حدیثیں (بلکہ قرآن کی آیتیں بھی) ان کی اس خام خیالی کے صریح خلاف ہیں، وہ ان سے منحرف ہیں۔

(اعاذنا اللّٰه من ذالك)

۱۴) **عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَفَاتِيْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔**

(رواه احمد)

ترجمہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دینا، جنت کی کُنجی ہے"۔ (مسند احمد)

تشریح ...... اس حدیث میں بھی صرف شہادتِ توحید کا ذکر ہے، اور یہ بھی دعوتِ ایمان کو قبول کرلینے، اور اسلام کو اپنا دین بنالینے کی ایک تعبیر ہے، اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ اردو محاورہ میں اسلام قبول کرنے کو "کلمہ پڑھ لینے" سے بھی تعبیر کردیتے ہیں۔ جس ماحول اور جس فضا کے رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات

ہیں، اس میں مسلمان بھی اور غیر مسلم کافر و مشرک بھی "توحید و رسالت کی شہادت" اور لا الٰہ الا اللہ کی شہادت "کا مطلب ایمان لانا، اور اسلام قبول کرنا ہی سمجھتے تھے۔

۱۵) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ وَ عَلَیْهِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَهُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُهٗ وَقَدْ اِسْتَیْقَظَ فَقَالَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذَالِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ، قَالَ وَ اِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ، قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ، قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ، قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ، قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ. (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں، کہ میں (ایکدن) حضور کی خدمت میں پہنچا، تو آپ اس وقت سفید کپڑا اوڑھے سوئے ہوئے تھے، پھر (کچھ دیر بعد) میں حاضر ہوا، تو آپ بیدار ہو چکے تھے، اسوقت آپ نے فرمایا: "جو کوئی بندہ لا الٰہ الا اللہ کہے اور پھر اسی پر اسکو موت آجائے، تو وہ جنت میں ضرور جائیگا"۔ ابوذر کہتے ہیں، میں نے عرض کیا: "اگرچہ اسنے زنا کیا ہو، اور اگرچہ اسنے چوری کی ہو؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "ہاں اگرچہ اسنے زنا کیا ہو، اگرچہ اسنے چوری کی ہو!" (ابوذر کہتے ہیں) میں نے پھر عرض کیا: "اگرچہ اسنے زنا کیا ہو، اگرچہ اسنے چوری کی ہو؟"۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: "(ہاں!) اگرچہ اُسنے زنا کیا ہو، اگرچہ اُسنے چوری کی ہو!"۔ (ابوذرؓ کہتے ہیں) میں نے (پھر تعجب سے) عرض کیا، کہ: "(یارسول اللہ! لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دینے والا جنت میں ضرور جائیگا) اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟"۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: "(ہاں!) ابوذر کے علی الرغم[1] (وہ جنت میں جائے گا) اگرچہ اسنے زنا کیا ہو، اگرچہ اُس نے چوری کی ہو!"۔

تشریح...... اس حدیث میں بھی "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے مراد پورے دینِ توحید (یعنی اسلام) پر ایمان لانا، اور اس کو اختیار کرنا ہے، اور بیشک جو شخص اس دینِ توحید پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہو گا، وہ ضرور جنت میں جائے گا، اب اگر بالفرض ایمان کے باوجود اسنے گناہ بھی کئے ہوں گے، تو اگر کسی وجہ سے وہ معافی کا مستحق ہو گا، تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما کے بغیر کسی عذاب ہی کے اُس کو جنت میں داخل کر دے گا اور اگر وہ معافی کا مستحق نہ ہو گا تو گناہوں کی سزا پانے کے بعد وہ جنت میں جا سکے گا، بہر حال دینِ اسلام پر صدقِ دل سے ایمان رکھنے والا ہر شخص جنت میں ضرور جائے گا، اگرچہ دوزخ میں گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہی جائے۔ حضرت ابوذرؓ کی اس روایت کا مطلب اور مفاد یہی ہے۔

حضرت ابوذرؓ نے جو بار بار اپنا سوال دُہرایا، تو اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ چوری اور زنا کو سخت ناپاک گناہ جاننے کی وجہ سے اُن کو اس پر تعجب تھا، کہ ایسے ناپاک گناہ کرنے والے بھی جنت میں جا سکیں گے، گویا اُس وقت تک انہیں یہ مسئلہ معلوم نہ تھا، آج ہم جیسوں کو حضرت ابوذرؓ کے اس تعجب اور اس سوال کی وجہ سمجھنا اس لئے مشکل ہو گیا ہے کہ ہم نے اسلام ہی میں آنکھ کھولی ہے، اور یہ موٹی موٹی باتیں ہم کو گھروں ہی میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

[1] عربی زبان کا یہ ایک خاص محاورہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے، کہ اگر یہ کام تمہیں ناگوار بھی ہو، اور تم اس کا ہونا نہ بھی چاہتے ہو، جب بھی یہ ہو کر رہے گا۔ ۱۲۔

۱۶) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ.　　　(رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت عثمان بن عفانؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اس حال میں مرا، کہ وہ یقین کے ساتھ جانتا تھا، کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو وہ جنت میں جائے گا۔

تشریح ... اس حدیث میں بھی "لا الٰہ الا اللہ" پر یقین ہونے سے مراد وہی دین توحید پر ایمان رکھنا ہے، اور دخول جنت کے وعدہ کا مطلب بھی وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا، کہ اپنے پورے اعمالنامہ کے تقاضے کے مطابق اللہ کی رحمت سے ابتداء ہی میں، یا گناہوں کی کچھ سزا بھگت کر ہر صاحب ایمان جنت میں ضرور جائے گا۔

۱۷) عَنْ عُتْبَانَ بْنِ مَالِكٍ (وَهُوَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا مِنَ الْاَنْصَارِ) اَنَّهُ اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ اَنْكَرْتُ بَصَرِيْ وَاَنَا اُصَلِّيْ لِقَوْمِيْ فَاِذَا كَانَتِ الْاَمْطَارُ سَالَ الْوَادِيْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ لَمْ اَسْتَطِعْ اَنْ اٰتِيَ مَسْجِدَهُمْ فَاُصَلِّيَ بِهِمْ وَوَدِدْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَّكَ تَاْتِيْنِيْ فَتُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِيْ فَاَتَّخِذَهُ مُصَلًّى قَالَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَاَفْعَلُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ عُتْبَانُ فَغَدَا عَلَيَّ وَاَبُوْ بَكْرٍ حِيْنَ ارْتَفَعَ النَّهَارُ، فَاسْتَاْذَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَذِنْتُ لَهُ فَلَمْ يَجْلِسْ حِيْنَ دَخَلَ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ اَيْنَ تُحِبُّ اَنْ اُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ قَالَ فَاَشَرْتُ لَهُ اِلٰى نَاحِيَةٍ مِنَ الْبَيْتِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَكَبَّرَ فَقُمْنَا فَصَفَفْنَا فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ، قَالَ وَحَبَسْنَاهُ عَلٰى خَزِيْرَةٍ صَنَعْنَا هَالَهُ قَالَ فَثَابَ فِي الْبَيْتِ رِجَالٌ مِنْ اَهْلِ الدَّارِ ذَوُوْعَدَدٍ فَاجْتَمَعُوْا فَقَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ اَيْنَ مَالِكُ بْنُ الدُّخَيْشِنِ اَوِ ابْنُ الدُّخْشُنِ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ ذَالِكَ مُنَافِقٌ لَا يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَقُلْ ذَاكَ اَلَا تَرَاهُ قَدْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُرِيْدُ بِذَالِكَ وَجْهَ اللّٰهِ؟ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّا نَرٰى وَجْهَهُ وَنَصِيْحَتَهُ اِلَى الْمُنَافِقِيْنَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذَالِكَ وَجْهَ اللّٰهِ.　　　(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ عتبان بن مالکؓ سے روایت ہے (اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ان اصحابؓ میں سے ہیں، جو انصار میں سے غزوۂ بدر میں شریک تھے) کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا، کہ: "میری نگاہ میں فرق آ گیا ہے (یعنی مجھے کم دکھائی دینے لگا ہے) اور میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں، سو جب بارشیں ہوتی ہیں اور میرے اور میری قوم والوں کے درمیان جو نالہ ہے، وہ بہنے لگتا ہے، تو میں اُنکی مسجد تک جا کر نماز نہیں پڑھا سکتا اور یا رسول اللہ (ﷺ)! میری یہ خواہش ہے، کہ حضور میرے یہاں تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز پڑھیں، تاکہ میں اسی جگہ کو اپنی مستقل نماز گاہ بنالوں"۔ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا: "انشاء اللہ تعالیٰ میں ایسا کروں گا"۔ (عتبان کہتے ہیں) کہ صبح ہی کو جب کچھ دن چڑھا تھا رسول اللہ اور ابو بکرؓ میرے یہاں پہنچ گئے، اور رسول اللہ ﷺ نے اندر آنے کی اجازت چاہی، میں نے آپ کو اجازت دی، پس جب آپ گھر میں تشریف لائے، تو بیٹھے نہیں، اور مجھ سے فرمایا: "تم اپنے گھر میں سے کون سی جگہ پسند

کرتے ہو، کہ میں وہاں نماز پڑھوں؟" کہتے ہیں کہ میں نے گھر کی ایک جانب کی طرف اشارہ کر دیا، پس رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے، اور اللہ اکبر کہہ کر آپ نے نماز شروع کر دی، ہم بھی صف باندھ کے آپ کے پیچھے کھڑے ہوگئے، پس آپ نے دو رکعتیں پڑھیں، اور سلام پھیر دیا، (عتبان کہتے ہیں) اور ہم نے آپ کو خزیرہ[1] کھانے کیلئے روک لیا، جو آپ کے واسطے ہم نے تیار کیا تھا، اور (آپ کی اطلاع پا کے) محلہ والوں میں سے بھی چند آدمی آ کے جڑ گئے، پس انہی میں سے کسی کہنے والے نے کہا، کہ مالک بن دخیشن (یا ابن دخشن) کہاں ہے؟ انہی میں سے کسی نے جواب دیا، کہ "وہ تو منافق ہے، اللہ اور اسکے رسول سے اُسے محبت ہی نہیں ہے"۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ مت کہو! کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ وہ "لا الٰہ الا اللہ" کا قائل ہے، اور اس سے وہ اللہ کی رضا ہی چاہتا ہے"۔ اس کہنے والے شخص نے کہا، کہ "اللہ اور اسکے رسول ہی کو زیادہ علم ہے، ہم تو اُس کا رخ اور اُس کی خیر خواہی منافقوں کی طرف دیکھتے ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "یقیناً اللہ عز و جل نے دوزخ کی آگ پر اُس شخص کو حرام کر دیا ہے، جس نے اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہا ہو، اور اُس کا ارادہ اس کلمہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنا ہی ہو"۔

تشریح..... اس حدیث میں بھی لا الہ الا اللہ کہنے والے پر آتشِ دوزخ حرام ہونے کا مطلب وہی ہے، جو اسی مضمون کی سابقہ احادیث کی تشریح کے ضمن میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ بلکہ اس حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں بجائے "قال لا الہ الااللہ" کے "یشہد ان لا الہ الااللہ وانی رسول اللہ" ہے اور مراد ان دونوں ہی عنوانوں سے دعوتِ اسلام کو قبول کرنا اور دینِ اسلام کو بحیثیت دین کے اختیار کر لینا ہے، دراصل جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے عہد نبوی میں اسلام قبول کرنے اور اسلام کو اختیار کرنے کی یہ عام تعبیر تھی۔

یہاں ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھنی چاہئے، کہ جن صحابی نے مالک بن دخشن کو منافق کہا تھا، اُن کی نظر میں بھی مالک بن دخشن میں نفاق یا فسق و فجور کی کوئی بات اسکے سوا نہ تھی، کہ اُن کے خیال میں مالک بن دخشن، منافقین سے تعلقات اور میل ملاقات رکھتے تھے۔

اس سے ایک طرف تو صحابۂ کرامؓ کے ایمانی جذبے کا اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ اتنی سی بات سے بھی اس قدر ناراض ہوتے تھے، اور اس کو منافقت سمجھتے تھے۔ اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کی تنبیہ سے سبق ملتا ہے کہ جن لوگوں میں اس طرح کچھ کمزوریاں ہوں، مگر اپنے ایمان اور توحید و رسالت کی شہادت میں وہ مخلص ہوں، تو ان کے بارے میں ایسی بد گمانیاں اور اتنی سخت باتیں کرنی جائز نہیں، بلکہ ایمان کا پہلو زیادہ قابلِ لحاظ اور واجب الاحترام ہے۔

یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ یہ مالک بن دخیشن بھی رسول اللہ ﷺ کے اُن صحابہ میں سے ہیں، جو عام غزوات میں حتیٰ کہ بدر میں بھی شریک رہے ہیں، ممکن ہے کہ منافقین سے تعلقات رکھنے میں، حاطب بن

---

[1] خزیرہ ایک قسم کے کھانے کا نام ہے، جو گوشت کی بوٹیوں میں پانی چھوڑ کر پکایا جاتا ہے، جب وہ پک چکتا ہے، تو اُس میں آٹا ڈال کر خوب پکاتے ہیں۔ ۱۲

ابی بلتعہؓ کی طرح ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہوں۔ واللہ اعلم۔

١٨) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَمَعَنَا اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ فِیْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَأَ عَلَيْنَا وَخَشِيْنَا اَنْ يُّقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ...... اَبْتَغِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی اَتَيْتُ حَائِطًا لِلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُ لَهٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِیْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِيْرٍ خَارِجَةٍ (وَالرَّبِيْعُ الْجَدْوَلُ) قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ مَاشَانُكَ؟ قُلْتُ كُنْتَ بَيْنَ اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَ هٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِیْ فَقَالَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَعْطَانِیْ نَعْلَيْهِ فَقَالَ اِذْهَبْ بِنَعْلَیَّ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيَكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرَ ، فَقَالَ مَاهَاتَانِ النَّعْلَانِ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ، فَقُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَنِیْ بِهِمَا مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ، فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَیَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ اِرْجِعْ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِیْ عُمَرُ وَاِذَاهُوَ عَلٰی اِثْرِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَالَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهٗ بِالَّذِیْ بَعَثْتَنِیْ بِهٖ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَیَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا عُمَرُ مَاحَمَلَكَ عَلٰی مَا فَعَلْتَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اَبَعَثْتَ اَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِیَ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ ، قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَخَلِّهِمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک دن ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (کی خدمت میں حاضر تھے، اور) آپ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ہمارے ساتھ ہی اس مجلس میں تھے، کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھے (اور کسی طرف کو نکل گئے) اور پھر آپ کی واپسی میں بہت دیر ہو گئی، تو ہمیں ڈر ہوا، کہ کہیں ہم سے علیحدہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، (یعنی ہماری عدم موجودگی میں کسی دشمن وغیرہ سے آپ کو کوئی ایذا نہ پہنچ جائے)۔ پس اس خیال سے ہمیں سخت گھبراہٹ اور فکر لاحق ہوئی، اور ہم لوگ (آپ کی جستجو میں) نکل کھڑے ہوئے، اور سب سے پہلے میں ہی گھبرا کے حضورؐ کی تلاش میں نکلا، یہاں تک کہ انصار کے خاندان بنی النجار کے ایک باغ پر پہنچ گیا، جو چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا، اور میں نے اس کے چاروں طرف چکر لگایا، کہ اندر جانے کیلئے مجھے راستہ مل جائے، لیکن نہیں ملا۔ پھر مجھے پانی کی ایک گول (چھوٹی سی نہر) نظر پڑی، جو باہر کے ایک کنوئیں سے باغ کے اندر جاتی تھی (ابوہریرہؓ کہتے ہیں) میں سمٹ اور سکڑ کر اس میں سے باغ کے اندر

گھس گیا، اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا پہنچا، حضور نے فرمایا "ابو ہریرہ؟" میں نے عرض کیا "ہاں! یا رسول اللہ میں ہی ہوں"۔ آپ نے فرمایا "تم کیسے آئے؟" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ ہمارے درمیان تشریف رکھتے تھے، پھر وہاں سے اٹھ کر چلے آئے، اور جب دیر تک آپ کی واپسی نہیں ہوئی، تو ہمیں خطرہ ہوا کہ مبادا ہم سے علیحدہ آپ کو کوئی ایذا پہنچائی جائے، اسی خطرے سے گھبرا کے ہم سب چل پڑے، اور سب سے پہلے گھبرا کے میں ہی نکلا تھا، یہاں تک کہ میں اس باغ تک پہنچا، اور (جب مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا، تو) لومڑی کی طرح سمٹ سکڑ کے میں (اس کُول میں سے کسی طرح) گھس آیا ہوں اور دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں"۔ پھر حضورؐ نے اپنے نعلین مبارک مجھے عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ "میرے یہ جوتے لے کر جاؤ، اور اس باغ سے نکل کے جو آدمی بھی تمہیں ایسا ملے، جو دل کے پورے یقین کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو، اس کو جنت کی خوشخبری سنادو"۔ (ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، میں وہاں سے چلا) تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی، انھوں نے مجھ سے پوچھا: "ابو ہریرہؓ! تمہارے ہاتھ میں یہ دو جوتیاں کیسی ہیں؟"۔ میں نے کہا: "یہ حضور (ﷺ) کی نعلین مبارک ہیں، حضورؐ نے مجھے یہ دے کر بھیجا ہے، کہ جو کوئی بھی دل سے "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دینے والا مجھے ملے، میں اُس کو جنت کی خوشخبری سنادوں"۔ (ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، کہ) پس عمرؓ نے میرے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے میں اپنی سرینوں کے بل پیچھے کو گر پڑا، اور مجھ سے انھوں نے کہا: "پیچھے کو لوٹو"۔ میں روتا ہوا حضورؐ کے پاس واپس آیا، اور عمرؓ بھی میرے پیچھے پیچھے آئے، رسول اللہ ﷺ نے (مجھے اس حالت میں دیکھ کر) پوچھا "ابو ہریرہ! تمہیں کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا کہ عمرؓ مجھے ملے تھے، حضورؐ نے مجھے جو پیغام دے کر بھیجا تھا، میں نے وہ انہیں بتلایا، تو انھوں نے میرے سینے پر ایک ایسی ضرب لگائی جس سے میں اپنی سرینوں کے بل گر پڑا، اور مجھ سے کہا کہ پیچھے کو لوٹو"۔ رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "عمر! تم نے ایسا کیوں کیا؟" انھوں نے عرض کیا حضورؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! کیا آپ نے ابو ہریرہؓ کو اپنے نعلین مبارک دے کر اسلئے بھیجا تھا، کہ جو کوئی بھی دل کے یقین کے ساتھ "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دینے والا ان کو ملے، وہ اس کو جنت کی بشارت دیدیں؟" حضورؐ نے فرمایا: ہاں! میں نے ہی یہ کہہ کے بھیجا تھا"۔ عمرؓ نے عرض کیا "حضور! ایسا نہ کیجئے، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں لوگ بس اس شہادت ہی پر بھروسہ کر کے (سعی و عمل سے بے پرواہ ہو کے) نہ بیٹھ جائیں، لہٰذا انہیں اسی طرح عمل کرنے دیجئے۔" حضورؐ نے فرمایا: "تو جانے دو!"۔

تشریح ..... اس حدیث میں چند چیزیں وضاحت طلب ہیں:

۱) رسول اللہ (ﷺ) نے اس موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ کو اپنی نعلین مبارک کیوں عطا فرمائیں؟ شارحین نے اسکی توجیہ میں اگرچہ کئی باتیں کہی ہیں، لیکن ان سب میں زیادہ قرین قیاس یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو آپ نے جس بشارت عظمیٰ کے اعلان کیلئے بھیجا تھا، اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے آپ نے اپنی کوئی خاص نشانی بھی اُن کیساتھ کر دینا مناسب سمجھا اور اس وقت آپکے پاس ایسی چیز جو اس مقصد کیلئے آپ اُنکو دے سکتے تھے، یہ نعلین مبارک ہی تھیں، اسلئے وہی آپ نے انکو عطا فرمادیں۔ واللہ اعلم۔

۲) حضرت عمرؓ نے اس واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ جو سختی کا معاملہ فرمایا، اس کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کیلئے حضرت عمرؓ کی اس امتیازی حیثیت کو پیش نظر رکھنا چاہئے، جو صحابہ کرامؓ کی جماعت میں انکو حاصل تھی، یعنی وہ (اور حضرت ابو بکرؓ بھی) حضور (ﷺ) کے خاص شریک کار، محرم راز، مشیر خصوصی، اور گویا آپکے وزیر و نائب تھے اور صحابہ کرامؓ عام طور سے اُنکے اس امتیازی مقام کو پہچانتے تھے اور جس طرح ہر جماعت اور ہر خاندان کا بڑا، اپنے چھوٹوں کو تنبیہ اور سرزنش کا حق رکھتا ہے، اسی طرح حضرت عمرؓ بھی یہ حق رکھتے تھے اور بسا اوقات حسب ضرورت اس حق کو آپ استعمال بھی فرماتے تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ چھوٹوں کی اصلاح وتربیت کیلئے بڑوں کے واسطے اس حق کا ماننا ضروری بھی ہے، پس حضرت عمرؓ نے اس واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کیسا تھ جو تشدد کیا، وہ درحقیقت اسی قبیل سے ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابتداءً ان سے واپس ہونے کو کہا ہوگا، لیکن وہ چونکہ تمام اہل ایمان کے لئے ایک بشارت عظمیٰ کا پروانہ لے کر آرہے تھے، اور اُن کے نزدیک یہ ایک بڑی سعادت تھی جو انہیں حاصل ہورہی تھی، اسلئے انہوں نے واپس ہونے سے انکار کیا ہوگا، اور بالآخر حضرت عمرؓ نے ان کو واپس لوٹانے کیلئے اس جبر و تشدد سے کام لیا ہوگا، کیونکہ ان کو مقام نبوت اور شئون نبوت کی پوری شناسائی کی وجہ سے اسکا کامل یقین تھا، کہ اس بشارت عامہ کا مضر پہلو جب حضور (ﷺ) کے سامنے آئیگا، تو آپ بھی اسکو خلاف مصلحت ہی سمجھیں گے، اور ابوہریرہؓ کو اس کی عام اشاعت سے منع فرمادینگے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے، کہ ایک دفعہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت معاذؓ کو بھی ایسی ہی بشارت سنائی تھی (وہ حدیث اوپر گزر چکی ہے) اس وقت حضرت معاذؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگی تھی، کہ وہ سب مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنادیں، تو حضور نے اجازت نہیں دی تھی، اور اجازت نہ دینے کی وجہ یہی بیان فرمائی تھی کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر کے دینی ترقیوں سے رہ جائیں گے۔

۳) اس حدیث میں بھی صرف "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت پر جنت کی خوشخبری دی گئی ہے، سو اس کی ایک عام توجیہ تو وہی ہے، جو مندرجہ بالا احادیث کے ذیل میں ذکر کی جاچکی ہے۔ ماسوا اُسکے، اس حدیث کے الفاظ میں اس احتمال کی بھی کافی گنجائش ہے، کہ حضور (ﷺ) کا مطلب اس ارشاد سے صرف یہ ہو کہ جو کوئی "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دے، یعنی صدق دل سے دین توحید (اسلام) پر ایمان لائے، اُس کو خوشخبری دے دی جائے کہ وہ ضرور جنت میں جائے گا، اگرچہ گناہوں کی سزا پانے کے بعد ہی جائے، اس صورت میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔

اسکے سوا ایک خاص نکتہ یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے، کہ مقربین بارگاہِ قدس پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے بے پناہ قہر و جلال اور شانِ غضب وانتقام کا جب خاص انکشاف ہوتا ہے، تو اُن پر ہیبت اور خوف کا غلبہ ہوجاتا ہے، اور اُس وقت کا ادراک واحساس یہ ہوتا ہے کہ شاید کسی بھی نافرمان کی نجات نہ ہوسکے گی، اور اُس خاص حال میں اُن کے ارشادات اس طرح کے ہوتے ہیں، کہ جو یہ گناہ کرے گا جنت میں نہیں جاسکے گا، جو وہ گناہ کرے گا، جنت کی ہوا بھی نہیں پاسکے گا، وغیرہ وغیرہ...... اور اسی طرح جب دوسرے بعض

اوقات میں اُن پر اللہ تعالیٰ کی شان رحمت اور اسکے بے حساب اور بے اندازہ فضل و کرم کا انکشاف ہوتا ہے، تو اُن پر رجا اور امید رحمت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور اُس عالم میں اُن کا ادراک واحساس یہ ہوتا ہے کہ جس میں کچھ بھی ذرۂ خیر ہوگا وہ بخشا ہی جائے گا، اور ایسے ہی احوال میں اُن حضرات کی زبانوں سے اس طرح کی عام بشارتیں نکلتی ہیں...... اسی نکتے کو عارف شیرازیؒ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

بہ تہدید گر برکشد تیغ حکم بمانند کروبیاں صم وبکم
وگر دردہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

پس حدیث مندرجہ بالا کے بارے میں یہ بھی بہت زیادہ قرین قیاس ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جس وقت بنی النجار کے اُس باغ میں حضورﷺ کے پاس پہنچے ہوں، تو اُس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں شئونِ رحمت اور تجلیاتِ کرم کے مراقبے و مشاہدے میں مستغرق ہوں، اور اسی حالت میں آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بطور نشانی اپنی نعلینِ مبارک عطا فرما کر ہر شاہد توحید کو جنت کی خوشخبری سنا دینے کا حکم دے دیا ہو، لیکن حضرت عمرؓ چونکہ اس پوری حقیقت کے رازداں اور ان احوال و کیفیات کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر تھے، اسلئے انھوں نے حضورﷺ سے براہِ راست مراجعت و تحقیق تک حضرت ابو ہریرہؓ کو اسکے اعلانِ عام سے روکا ہو، دوسرے طور پر اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ حضرت عمرؓ پر اُس وقت رسول اللہﷺ کے قلبِ مبارک کی اُس خاص کیفیت (یعنی غلبۂ رجا و رحمت) کا انکشاف منجانب اللہ ہو چکا تھا، اور اُن کو اپنے نورِ فراست سے اس بات کا یقین تھا، کہ جب آنحضرتﷺ پر اس کیفیت کا غلبہ نہیں رہے گا، اور اس اعلان کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے رکھا جائے گا، تو خود آپ اُس کو منع فرما دیں گے، جیسا کہ ظہور میں آیا...... اس طرح کے مواقع پر صحیح حقیقت کا ادراک و انکشاف حضرت عمرؓ کی امتیازی فضیلت ہے، جس کو حدیثِ نبوی میں "مقامِ محدّثیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایک اور اصولی بات جس سے اسطرح کی بہت سی حدیثوں کا اشکال حل ہو جاتا ہے

اس قسم کی آیات یا احادیث پر غور کرتے وقت ایک اصولی بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ اس قسم کی بشارتوں میں متکلم کا مقصد اور مطمح نظر کسی عمل خیر کی ذاتی خاصیت اور اسکا اصلی اثر بتلانا ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اگر دوسرے اعمال کا تقاضا اسکے خلاف ہو، تو پھر انجام کیا ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ طب کی کتابوں میں اسی اصول پر دواؤں کے خواص بیان کئے جاتے ہیں، مثلاً لکھا جاتا ہے، کہ جو شخص اطریفل استعمال کرتا رہے گا، وہ ہمیشہ نزلہ سے محفوظ رہے گا، اب اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شخص اطریفل کھانے کے ساتھ ساتھ تیل، ترشی وغیرہ انتہائی درجے کی نزلہ پیدا کرنے والی چیزیں بھی برابر کھاتا رہے، اُس کو بھی کبھی نزلہ نہ ہوگا، سخت نافہمی اور اطبا کے طرز کلام سے ناواقفی ہے۔

اس اصول کی روشنی میں اس قسم کی حدیثوں کا مدعا صرف اتنا ہی ہے کہ توحید و رسالت کی شہادت کا ذاتی اقتضاء یہی ہے کہ ایسا آدمی عذاب دوزخ سے محفوظ رہے، اور جنت میں جائے، لیکن اگر اُسنے اپنی بدبختی سے کچھ ایسے بد اعمال بھی کئے ہیں جن کا ذاتی اقتضاء قرآن و حدیث میں عذاب پانا، اور دوزخ میں جانا ہی بتلایا

گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہی دکھائیں گے۔
اگر یہ چھوٹا سا نکتہ ملحوظ رکھا جائے، تو وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی صدہا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی اور اس کی وجہ سے جو الجھن ہوتی ہے، وہ انشاء اللہ نہ ہو گی۔

۱۹) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَیْرِ مَا یَزِنُ شَعِیْرَةً ثُمَّ یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَیْرِ مَایَزِنُ بُرَّةً ثُمَّ یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَكَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَیْرِ مَایَزِنُ ذَرَّةً۔
(رواہ البخاری و مسلم واللفظ لہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دوزخ میں سے وہ سب لوگ نکال لئے جائیں گے جنھوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا، اور اُن کے دل میں جَو کے دانے کے برابر بھی بھلائی تھی، پھر وہ لوگ بھی نکالے جائیں گے جنھوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا، اور ان کے دل میں گیہوں کے دانے برابر بھی بھلائی تھی اور اُسکے بعد وہ لوگ بھی نکالے جائیں گے جنھوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا، اور اُن کے دل میں ذرہ برابر بھی بھلائی تھی۔

تشریح ...... جیسا کہ بعض احادیثِ سابقہ کی تشریح میں مفصل اور مدلل طور پر لکھا جا چکا ہے اُسی طرح اس حدیث میں بھی "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے مراد "دینِ اسلام" قبول کرنا، اور اس کا اقرار کرنا ہے اور اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوں، اور اپنے کو اسلام سے وابستہ کرتے ہوں، اور اُن کے دل میں ذرہ برابر خیر (یعنی نورِ ایمان) ہو، تو وہ بالآخر دوزخ سے نکال ہی لئے جائیں گے۔ اس روایت میں تین جگہ 'خیر' کا لفظ آیا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے بھلائی کیا ہے، لیکن حضرت انسؓ کی اسی حدیث کی ایک دوسری روایت میں (جس کو امام بخاریؒ نے بھی ذکر کیا ہے) بجائے خیر کے ایمان کا لفظ بھی آیا ہے، جو اس بات کا صاف قرینہ ہے کہ یہاں خیر سے مُراد نورِ ایمان ہی ہے۔
اس حدیث سے دو نہایت اہم باتیں جو اہلِ حق کے خاص اجماعی عقائد میں سے ہیں، پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ معلوم ہو جاتی ہیں۔
ایک یہ کہ بہت سے لوگ کلمہ اسلام پڑھنے کے باوجود اپنی بداعمالیوں کے سبب دوزخ میں بھی ڈالے جائیں گے۔
اور دوسرے یہ کہ اگر اُن کے دلوں میں خفیف سے خفیف اور ضعیف سے ضعیف، حتیٰ کہ (حدیث کی تصریح کے مطابق) ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا، تو بالآخر وہ دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کا مؤمن بھی کافروں کی طرح ہمیشہ دوزخ میں رہے۔ اگرچہ وہ اعمال کے لحاظ سے کیسا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔
اس مضمون کی حدیثیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں حضرت انسؓ کے علاوہ حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت جابرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہیں، اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ مضمون ان حضرات

کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابو موسیٰ وغیرہ متعدد صحابہ کرامؓ سے روایت کیا گیا ہے، بہر حال فن حدیث کی معرفت اور علوم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کے نزدیک یہ مضمون آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے، بلکہ صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی جو مفصل روایت ہے، اُس میں صراحت کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ جو گنہگار مسلمان دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اُن کے حق میں نجات یافتہ مؤمنین اللہ تعالیٰ سے بڑے الحاح کے ساتھ عفو و درگزر اور بخشش و کرم کی استدعا کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کی اس استدعا و التجا کو قبول فرما کر اُنہی کو اجازت دیدیں گے، کہ جاؤ جس میں ایک دینار برابر بھی خیر تمہیں نظر آئے اس کو نکال لو، چنانچہ ایک بہت کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی نکال لی جائے گی، پھر ان کو اجازت دی جائیگی کہ جاؤ ایسے لوگوں کو بھی نکال لو جن میں نصف دینار کے برابر خیر بھی تمہیں نظر آئے، چنانچہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی نکال لی جائے گی پھر حکم ہوگا کہ جاؤ ایسے لوگوں کو بھی نکال لو جن کے اندر ذرہ برابر خیر بھی تمہیں نظر آئے، چنانچہ پھر بہت بڑی تعداد اس درجے کے لوگوں کی بھی نکال لی جائے گی، اور اسکے بعد یہ سفارش کرنے والے خود عرض کریں گے: ربنا لم نذر فیھا خیرا (خداوندا! اب دوزخ میں ہم نے کچھ بھی خیر رکھنے والا کوئی آدمی نہیں چھوڑا ہے)...... اسکے بعد حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا۔

”شَفَعَتِ الْمَلٰئِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوْا خَيْرًا قَطُّ“۔

(فرشتوں کی بھی سفارش ہو چکی، اور نبیوں کی بھی سفارش ہو چکی، اور مؤمنین کی بھی سفارش ہو چکی اور ان کی سفارشیں بھی قبول کی جا چکیں، اور اب بس ارحم الراحمین ہی کی باری رہ گئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود اپنے مغفرت و رحمت کے ہاتھ سے ایسے لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال لیں گے، جنہوں نے کبھی کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا)۔

آگے حضرت ابو سعیدؓ کی اسی حدیث کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق یہ بھی ہے کہ:

”هٰؤُلَاءِ عُتَقَاءُ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اَدْخَلَهُمُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْهُ وَلَا خَيْرٍ قَدَّمُوْهُ“۔

(یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے چھوڑے ہوئے ہوں گے اللہ اُن کو جنت میں داخل کرے گا بغیر عمل کے، جو انہوں نے کیا ہو، اور بغیر خیر کے جو انہوں نے پیش کیا ہو)۔

گویا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس بہت ہی ضعیف اور نہایت ہی خفی ایمان کے سوا عمل صالح اور خیر کا کوئی سرمایہ بالکل نہ ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ بالآخر اُن کو بھی اپنے رحم و کرم سے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیں گے۔

اس مسئلہ میں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مرجیہ اور خوارج نے افراط اور تفریط کی راہ اختیار کی تھی، اور آج کل بھی بعض حلقوں کا رجحان افراط کی طرف اور بعض کا تفریط کی طرف ہو رہا ہے۔ اسلئے ہم نے حدیث کی نفسِ تشریح سے زیادہ چند سطریں لکھنی ضروری سمجھیں۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

(۲۰) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لَمَّا جَعَلَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ فِیْ قَلْبِیْ اَتَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَقُلْتُ اُبْسُطْ یَمِیْنَكَ فَلَاُ بَایِعْكَ فَبَسَطَ یَمِیْنَهٗ فَقَبَضْتُ یَدِیْ فَقَالَ مَالَكَ یَا عَمْرُو قُلْتُ اَرَدْتُ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا؟ قُلْتُ اَنْ یُّغْفَرَلِیْ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ یَا عَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهَا وَاَنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ. (رواه مسلم)

حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام لانے کا خیال میرے دل میں ڈالا، تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے عرض کیا، اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں، پس آپ نے اپنا داہنا ہاتھ آگے کر دیا، پس میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، تو آپ نے فرمایا: عمرو! تمہیں کیا ہوا؟ (یعنی تم نے اپنا ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟) میں نے عرض کیا: میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا: تم کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا یہ کہ میری خطائیں بخش دی جائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے، کہ اسلام قبول کرنا پہلے سب گناہوں کو ڈھا دیتا ہے، اور ہجرت بھی پہلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج بھی پہلے گناہوں کو زائل کر دیتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے گناہوں کی مغفرت کے بارے میں اسلام کے علاوہ ہجرت اور حج کی تاثیر کا ذکر اس موقع پر یہ ظاہر کرنے کے لئے فرمایا کہ اسلام تو اسلام، اُسکے بعض اعمال میں بھی گناہوں سے پاک صاف کر دینے کی خاصیت ہے..... لیکن دو باتیں یہاں خاص طور قابلِ لحاظ ہیں، ایک یہ کہ اسلام لانے اور ہجرت یا حج کرنے کی یہ تاثیر اس صورت میں ہے، جبکہ یہ کام صدقِ نیت اور اخلاص کے ساتھ کئے جائیں..... دوسرے یہ کہ دلائلِ شرعیہ سے یہ بات اپنی جگہ ثابت شدہ ہے، کہ اگر کسی کے ذمے اللہ کے بندوں کے حقوق ہیں، خصوصاً مالی حقوق تو اسلام یا ہجرۃ یا حج سے وہ معاف نہیں ہوتے، اُن کا معاملہ حقداروں ہی سے صاف کرنا ضروری ہے۔

کفر و شرک کی زندگی سے تائب ہو کر اسلام قبول کرنے والوں کے پچھلے گناہوں کی معافی کا وعدہ قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

"قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ"

(اے رسول! اُن لوگوں سے کہہ دیجئے جنھوں نے کفر کا ارتکاب کیا، کہ اگر وہ باز آ جائیں، تو اُن کے پچھلے گناہ بخشد یے جائیں گے)۔

(۲۱) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ یُکَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ کُلَّ سَیِّئَةٍ کَانَ زَلَّفَهَا وَکَانَ بَعْدَ ذَالِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی

سَبْعِمِأَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَّتَجَاوَزَ اللهُ عَنْهَا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے، کہ:
"جب بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور اُسکا اسلام اچھا ہوتا ہے، تو جو بُرائیاں اس نے پہلے کی ہوتی ہیں، اللہ اسلام کی برکت سے اُن سب کو معاف کر دیتا ہے اور اُسکے بعد اُسکی نیکیوں اور بدیوں کا حساب یہ رہتا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنے سے لیکر سات سو گنے تک ثواب دیا جاتا ہے اور بُرائی کرنے پر وہ اُسی ایک بُرائی کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس سے بھی درگزر فرمائے اور معاف ہی فرما دے"۔

تشریح...... اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دین (اسلام) کو اپنا دین بنانے سے، اور مسلمان ہو جانے سے پچھلے گناہ معاف ہونے کی یہ شرط ہے کہ اسلام کا حُسن بھی زندگی میں آ جائے (یعنی اُسکا قلب و باطن نورِ اسلام سے منور اور قالب و ظاہر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے مزین اور آراستہ ہو جائے۔ "حسن اسلامه" کا یہی مطلب ہے۔ پس اگر کسی شخص کی زندگی اسلام میں آ جانے کے بعد بھی نورِ اسلام اور اسلام کے حُسن سے خالی رہی، اور اُسکے ظاہر و باطن پر اسلام کا رنگ نہیں چڑھا، تو پچھلے سب گناہوں سے معافی کا یہ اعلان اُس کے لئے نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بھی اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک دیئے جانے کا انعامی قانون بھی اُنہی بندوں کے لئے ہے جنھوں نے اسلام کا کچھ حُسن اپنے اندر پیدا کر لیا ہو، اور اس حُسن کی کمی بیشی کے حساب سے ہی نیکیوں کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک ملے گا۔

ایمان لانے کے بعد جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں

۲۲) **عَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّااللهُ فَمَنْ قَالَهَا فَقَدْ عَصَمَ مِنِّىْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَى اللهِ۔** (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اسوقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ "لا اله الا الله" کے قائل نہ ہو جائیں، پس جو شخص "لا اله الا الله" کا قائل ہو گیا اسنے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا، سوائے اُسکے حق کے اور اُسکا حساب اللہ کے سپرد ہے"۔

تشریح...... حضرت عمرؓ سے اس حدیث کی روایت اُس مکالمہ کے ضمن میں آتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ادائیگی زکوٰۃ سے انکار کرنے والے بعض قبائل کے خلاف جنگ کرنے کے بارے میں اُن کے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے درمیان ہوا تھا۔

اس حدیث میں بھی "لا اله الا الله" کہنے سے مُراد، دعوتِ اسلام کا قبول کرنا ہے، اور جس طرح مذکورہ سابق احادیث میں اسلام قبول کرنے کا اُخروی نتیجہ عذابِ دوزخ سے نجات اور حصول جنت بتایا گیا ہے، اسی طرح اس حدیث میں قبول اسلام کا ایک دینوی اور قانونی نتیجہ جان و مال کا محفوظ و مامون ہو جانا بتلایا گیا ہے۔

نیز اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسلامی جنگ کے متعلق ایک نہایت اہم اور اصولی اعلان بھی فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ ہماری جنگ کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے بندوں کو اس کی بندگی کے رستے پر لگایا جائے، اور ان کو عذابِ ابدی سے نجات دلائی جائے، لہذا جو کوئی اللہ کے دین کو قبول کرلے، اور اللہ ہی کی بندگی کا اقرار کر کے اُسکے مقرر کئے ہوئے طریقۂ زندگی (دینِ اسلام) کو اپنا دین بنالے، اسکے جان و مال کو ہماری طرف سے بالکل امن ہے۔

"الا بحقه" کا مطلب یہ ہے کہ البتہ اگر اُسنے اسلام اختیار کرنے کے بعد کوئی ایسا جرم کیا، کہ خود اللہ کے قانون کا تقاضا اُس کو جانی یا مالی سزا دینے کا ہوا، تو خداوندی حکم کے مطابق اس کو سزا دیجائے گی، اور "لا الہ الا اللہ" کہنے اور مسلمان کہلانے کی وجہ سے وہ اس قانونی سزا سے نہیں بچ سکے گا۔

"وحسابہ علی اللہ" کا مطلب یہ ہے، کہ جو شخص کلمۂ اسلام پڑھ کے اپنا ایمان لانا ہمارے سامنے ظاہر کرے گا، ہم اُس کو مؤمن اور مسلم تسلیم کر کے اُسکے خلاف جنگ بند کردیں گے، اور اُس کے ساتھ ایمان و اسلام ہی کا معاملہ کریں گے، لیکن اگر فی الواقع اُس کی نیت میں کوئی برائی، اور اسکے دل میں کوئی کھوٹ ہوگی، تو اس کا حساب آخرت میں اللہ تعالیٰ پر ہے، جو عالم الغیب اور علیم بذات الصدور ہے، وہ ہی اُس سے حساب کرلے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث قریب قریب انہی الفاظ میں صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ اور طارق اشجعیؓ سے بھی روایت کی گئی ہے، اور بعض دوسرے صحابۂ کرامؓ نے اس مضمون کو کسی قدر تفصیل سے بھی روایت کیا ہے، جس سے اس حدیث کے مضمون کی بھی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے، ہم اُن میں سے بعض روایات ذیل میں درج بھی کرتے ہیں۔

۲۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَیُؤْمِنُوْا بِیْ وَبِمَا جِئْتُ بِهٖ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَ حِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ . (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ: "مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کی شہادت دیں، اور مجھ پر اور جو ہدایت میں لیکر آیا ہوں اُس پر ایمان لے آئیں، سو جب وہ ایسا کرلیں، تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا، سوائے اُسکے حق کے اور اُن کا حساب اللہ کے سپرد ہے"۔ (مسلم)

تشریح...... اس حدیث میں "لا الہ الا اللہ" کی شہادت کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر اور آپکے لائے ہوئے دین پر ایمان لانے کا بھی ذکر ہے، یہ بھی اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس سے پہلی حدیث میں "لا الہ الا اللہ" کے قائل ہونے کا جو ذکر ہے، اس سے دعوتِ اسلام کا قبول کرنا ہی مراد ہے۔

۲۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ

وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُواالزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّابِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللہِ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں اُسوقت تک کہ وہ اس بات کی شہادت ادا کریں (یعنی اس کا اقرار و اعلان کریں) کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد اللہ کے پیغمبر ہیں، اور نماز قائم کرنے لگیں، اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں، پس جب وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا سوائے حق اسلام کے، اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح ...... اس حدیث میں توحید و رسالت کی شہادت کے علاوہ نماز قائم کرنے، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی ذکر ہے ...... اور در حقیقت ان دو رکنوں کا ذکر بھی صرف تمثیل اور نشانی کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ یہاں بھی مراد یہی ہے کہ اللہ کے دین پر ایمان لے آئیں، اور دعوتِ اسلام کو قبول کر لیں، جس کو حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ بالا حدیث میں "وَیُؤْمِنُوْا بِیْ وَبِمَا جِئْتُ بِہٖ" (اور مجھ پر ایمان لائیں، اور جو ہدایت میں لایا ہوں اس پر ایمان لائیں) کے مختصر، مگر جامع الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۲۵) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، فَاِذَا قَالُوْھَا وَصَلُّوْا صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا وَاَکَلُوْا ذَبِیْحَتَنَا فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَیْنَا دِمَاءُھُمْ وَ اَمْوَالُھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَ حِسَابُھُمْ عَلَی اللہِ ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں، یہاں تک کہ وہ "لا الٰہ الا اللہ" کے قائل ہو جائیں، پس جب وہ "لا الٰہ الا اللہ" کے قائل ہو جائیں اور ہماری نمازیں پڑھنے لگیں، اور (اپنی نمازوں میں) ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرنے لگیں، اور ہمارا ذبیحہ کھانے لگیں، تو ان کے خون اور ان کے مال ہم پر حرام ہو گئے سوائے انکے حق کے، اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے"۔ (بخاری)

تشریح ...... اس حدیث میں شہادتِ توحید کے ساتھ نماز پڑھنے اور نماز میں قبلہ اسلام کی طرف رخ کرنے اور اہل اسلام کا ذبیحہ کھانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے، در حقیقت ان تمام چیزوں کا ذکر بھی بطور علامات اور نشانیوں ہی کے کیا گیا ہے، اور اصل مقصد اس حدیث کا بھی احادیث مندرجۂ بالا کی طرح صرف اتنا ہی ہے، کہ ہماری جنگ جس کسی سے بھی ہے صرف دین کی خاطر، اور لوگوں کو کفر و شرک کی گمراہی سے نکال کر راہِ حق پر لانے کیلئے ہے، پس جو لوگ بے راہ روی چھوڑ کر اللہ کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ اختیار کر لیں اور دینِ حق کی دعوت کو قبول کر لیں، اُن کے جان و مال سے تعرض کرنا ہمارے لئے حرام ہے اور چونکہ اس زمانہ اور اس ماحول میں ایمان و اسلام کی ظاہری علامات یہی تھیں، کہ آدمی مسلمانوں کے طریقے پر نماز پڑھنے لگے، اور نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے لگے، اور مسلمانوں کے ذبیحہ سے پرہیز نہ کرے، اس لئے رسول اللہ

نے علامات ہی کے طور پر ان چیزوں کا بھی ذکر کر دیا۔

اور اسی حدیث کی سنن ابی داؤد کی روایت میں [illegible] کی جگہ آخری الفاظ یہ ہیں: [illegible] ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دعوتِ اسلام کو قبول کر لیں، نہ صرف یہ کہ ہماری جنگ ان کے خلاف ختم ہو جائیگی، اور ان کے جان و مال کو امان حاصل ہو جائے گی، بلکہ پھر وہ تمام حقوق اور ذمہ داریوں میں بالکل ہمارے برابر ہوں گے۔

[illegible]

ان احادیث پر سرسری نظر میں ایک شبہ ہوتا ہے، بعض شارحین حدیث نے خود ہی اس کو ذکر کر کے مختلف جوابات بھی دیئے ہیں، وہ شبہ یہ ہے، کہ اسلام میں جزیہ اور مناسب شرائط کے ساتھ مصالحت کا اصول بھی مسلم ہے، اور ان دونوں صورتوں پر بھی جنگ ختم ہو جاتی ہے، لیکن ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ صرف اُس وقت روکی جائے گی، جبکہ لوگ دعوتِ اسلام قبول کر لیں۔

راقم سطور کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے، کہ ان احادیث کا مقصد اور موضوع، جنگ کو روک دینے اور اس کو ختم کر دینے کی صورتیں بتانا نہیں ہے، بلکہ ان ارشادات میں حضور کا مطمح نظر صرف دو چیزوں کو واضح کرنا ہے، ایک یہ کہ ہماری جنگ کی غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ لوگ اللہ ہی کی عبادت کرنے لگیں، اور اسکی متعین کی ہوئی سیدھی راہ پر چلنے لگیں، یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کر لیں، اور دوسرے یہ کہ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں گے، اُن کے جان و مال کو ہماری طرف سے قطعی امن ہو گا، بلکہ حقوق اور ذمہ داریوں میں وہ دوسرے مسلمانوں کے بالکل مساوی ہوں گے۔

رہا جزیہ یا خاص حالات میں خاص شرائط کے ساتھ مصالحت، سو اگرچہ یہ بھی جنگ ختم کر دینے کی صورتیں ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ اسلامی جنگ کی اصل غایت نہیں ہیں، بلکہ چونکہ ان کے ذریعے اصل مقصد یعنی دعوتِ اسلام کیلئے ایک پرامن راہ کھل جاتی ہے، اسلئے ان پر جنگ روک دی جاتی ہے۔

[illegible]

(٢٦) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ صَلّٰى صَلاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذَالِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِىْ لَهٗ ذِمَّةُ اللهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللهَ فِىْ ذِمَّتِهٖ. (رواه البخاری)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ نے فرمایا: "جو کوئی ہماری سی نماز پڑھے، اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے، اور ہمارا ذبیحہ کھائے، پس یہ وہ مسلم ہے جس کے لئے اللہ کی امان ہے اور اللہ کے رسول کی امان ہے، سو تم اللہ کے عہد نہ توڑو، اس کی امان کے بارے میں"۔

تشریح..... اس حدیث کا مقصد سمجھنے کیلئے یہ حقیقت پیش نظر رکھ لینی چاہئے، کہ حضور کے عہد مسعود میں جب دعوتِ اسلام طاقت اور قوت کے ساتھ بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی، تو بکثرت ایسے واقعات پیش آتے تھے کہ بعض لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے، لیکن خاص حالات میں ان کے متعلق اس شبہ کی

گنجائش رہتی تھی، کہ شاید انھوں نے حقیقی طور پر اور دل سے اسلام کو اختیار نہیں کیا ہے، پس رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا خاص تعلق ایسے ہی لوگوں سے ہے، اور آپ کا مقصد صحابہ کرامؓ کو یہ جتلانا ہے، کہ جس شخص میں تم اسلام قبول کرنے کی یہ ظاہری اور موٹی موٹی علامتیں دیکھو، کہ وہ اسلامی طریقے پر نماز پڑھتا ہے، اور نماز میں قبلۂ مسلمین کی طرف ہی رُخ کرتا ہے، اور اہل اسلام کا ذبیحہ کھاتا ہے، تو اُس کو مسلمان ہی سمجھو، اور اُسکے جان و مال کو اللہ اور اُسکے رسول کی امان میں سمجھو، یعنی خواہ مخواہ اس قسم کی کسی بدگمانی کی بناء پر کہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہے، بلکہ اسنے صرف منافقانہ طور پر ان اسلامی شعائر کو اختیار کر لیا ہے، اسکے خلاف کوئی اقدام نہ کرو، بہر حال اس حدیث کا مقصد اسی بارے میں مسلمانوں کو تنبیہ کرنا ہے۔

پس بعض لوگوں کا اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا مقصدِ حدیث سے ناواقفی اور سخت جاہلانہ گمراہی ہے کہ جس شخص میں اسلام کی یہ ظاہری علامتیں موجود ہوں (یعنی نماز پڑھنا، قبلہ کی طرف رُخ کرنا اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا) پھر خواہ وہ کیسے ہی خلاف اسلام عقائد و خیالات رکھے، اور خواہ کیسے ہی کافرانہ و مشرکانہ اعمال کرے، بہر حال وہ مسلمان ہی رہتا ہے۔

دراصل اس قسم کے لوگوں سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور ایسے لوگوں کو مسلمان قرار دینے کا مطلب تو یہ ہو گا کہ اسلام صرف ان ظاہری اعمال اور علامات ہی کا نام ہے، اور ایمان و اعتقاد کی اس میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ اسلام کے بارے میں اس سے زیادہ جہالت اور گمراہی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

مسلمان کسی گناہ اور بدعملی کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا

۲۷) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ لَا تُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ وَّلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ ، وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُذْبَعَثَنِىَ اللهُ اِلٰى اَنْ يُّقَاتِلَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَ لَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْاِيْمَانُ بِالْاَقْدَارِ ۔ (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تین باتیں اصولِ اسلام میں داخل ہیں: ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو، اسکے بارے میں زبان کو روکا جائے، یعنی کسی گناہ کی وجہ سے اُس کی تکفیر نہ کی جائے، اور کسی بدعملی کی وجہ سے اُس کو خارج از اسلام قرار نہ دیا جائے ...... دوسری چیز (اصولِ اسلام میں سے) جہاد ہے، وہ اُس وقت سے جاری ہے، جب مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا، اور اُس آخری زمانہ تک جاری رہے گا، جبکہ اس اُمت کا آخری طبقہ دجال سے جنگ کرے گا (مسلمانوں کے حکمران خواہ ظالم ہوں یا منصف، جہاد بہر حال جاری رہے گا) کسی ظالم حکومت کا ظلم اور عادل حکمران کا عدل اسکو ختم نہیں کرے گا، اور (اصول اسلام میں سے تیسری چیز) تقدیر پر ایمان لانا ہے۔"

تشریح ...... اس حدیث میں تین باتوں کو اصولِ اسلام میں سے بتلایا گیا ہے، اول یہ کہ کسی گناہ اور بدعملی کی

وجہ سے کسی ایسے شخص کی تکفیر نہ کی جائے، اور اسکے خارج از اسلام ہونیکا فتویٰ نہ دیا جائے، جو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو۔ اسکے بارے میں ایک بات تو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہونے کا مطلب وہی ہے جو پہلے بھی بار بار بیان کیا جا چکا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی دینی دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہو جانا، پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ عہدِ نبوی میں کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو جانا، اسلام قبول کر لینے کا عنوان تھا، خود ہماری زبان اردو میں بھی اسی محاورہ کے مطابق "کلمہ پڑھ لینے" کا مطلب اسلام قبول کر لینا سمجھا جاتا ہے۔

دوسری بات یہاں یہ قابل لحاظ ہے کہ اس حدیث میں کسی گناہ اور بد عملی کی وجہ سے اہلِ قبلہ کی تکفیر سے منع فرمایا گیا ہے، گویا رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے امت کو اس غلطی اور گمراہی سے بچانے کی کوشش فرمائی ہے، جس میں معتزلہ اور خوارج مبتلا ہوئے، وہ صرف معاصی اور بد اعمالیوں کی بناء پر بھی آدمی کو اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں، اور اہل سنت کا مسلک اس حدیث نبوی کے مطابق یہی ہے کہ کوئی مسلمان صرف اپنی بد عملی اور اپنے معاصی کی وجہ سے اسلام سے نہیں نکلتا اور کافر نہیں ہو جاتا۔

الغرض حدیث کے اس جز کا مقصد و مدعا یہی ہے، کہ جب ایک شخص کلمہ پڑھ کر ایمان لے آیا، اور اسلام کو اُسنے اپنا دین بنالیا، تو اسکے بعد اگر اس سے گناہ سرزد ہوں، اور وہ بد اعمالیوں میں مبتلا دیکھا جائے تو صرف عمل کی اس خرابی کی وجہ سے اس کو کافر اور خارج از اسلام نہ قرار دیا جائے..... پس ایسے لوگوں سے اس حدیث کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے، جو کسی ایسی چیز کا انکار کر کے خود ایمان و اسلام کے دائرے سے نکل جائیں جس پر ایمان لانا مسلمان ہونے کی شرط ہے۔

فرض کیجئے کہ کوئی شخص جو کلمہ پڑھ چکا ہے، اور اپنے کو مسلمان کہتا ہے، قرآن مجید کے کتاب اللہ ہونے سے منکر ہے، یا قیامت اور آخرت کا انکار کرتا ہے، یا خدائی کا یا نبوت کا دعویدار ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہے گا، اور اس کو لازماً کافر اور خارج از اسلام قرار دیا جائے گا۔ لیکن یہ تکفیر کسی بد عملی اور فسق و فجور کی وجہ سے نہ ہوگی، بلکہ اصولِ دین کے انکار کی وجہ سے ہوگی۔

بہر حال ان دونوں صورتوں میں جو فرق ہے وہ ملحوظ رہنا چاہئے، بعض لوگ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس حدیث کو بہت غلط استعمال کرتے ہیں۔

اس حدیث میں جہاد کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ: میری بعثت سے لیکر وہ اُسوقت تک جاری رہے گا جبکہ میری اُمت کا آخری طبقہ دجال کے خلاف جہاد کریگا، کسی ظالم کا ظلم اور منصف کا عدل و انصاف اسکو ختم نہیں کریگا۔ اس آخری فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت مسلمانوں کی حکومت کا نظام غلط ہاتھوں میں ہو اور حکمران غلط قسم کے اور ظالم ہوں، تب بھی جہاد ساقط نہ ہوگا اور کسی کیلئے یہ عذر کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ہم ان غلط کار حاکموں کی ماتحتی میں جہاد نہیں کریں گے، بلکہ حکومت پر تسلط خواہ اچھوں کا ہو یا بُروں کا بہر حال انکی ماتحتی میں جہاد کرنا ہوگا۔

دین و ایمان کے شعبے اور انکی شاخیں

۲۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ

اِلَّااللّٰهُ وَاَدْنَا هَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ: "ایمان کی ستر سے بھی کچھ اوپر شاخیں ہیں اور ان میں سب سے اعلیٰ اور افضل تو کا قائل ہونا، یعنی توحید کی شہادت دینا ہے اور ان میں ادنیٰ درجے کی چیز اذیت اور تکلیف دینے والی چیزوں کا راستے سے ہٹانا ہے اور حیا ایمان کی ایک اہم شاخ ہے"۔

...... اس حدیث میں ایمان کے شعبوں کے لئے کا جو عدد استعمال کیا گیا ہے، اسکے متعلق بعض شارحین نے لکھا ہے کہ: "اس سے غالباً صرف کثرت مُراد ہے، اور اہلِ عرب صرف مبالغہ اور کثرت کے لئے بھی ستر کا لفظ عام طور سے بولتے ہیں، اور ستر پر "جو کچھ اور" کا اضافہ اس حدیث میں کیا گیا ہے، یہ غالباً اور زیادہ مبالغہ پیدا کرنے کے لئے ہے"[1]...... لیکن بعض حضرات نے کے لفظ سے خاص عدد ستتر(۷۷) بھی سمجھا ہے، اس بنیاد پر کہ لفظ خاص سات(۷) کے عدد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور پھر ان حضرات نے اپنے اس خیال کے مطابق ایمان کے ان ستتر(۷۷) شعبوں کو متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے[2]، لیکن ان میں غور کرنے کے بعد یہی رائے قائم ہوتی ہے کہ یہ محض تخمینے ہیں جن میں بہت کچھ ردو قدح کی گنجائش ہے، اس لئے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا کے لفظ سے کوئی خاص عدد معین کرنا نہیں ہے، بلکہ محاورۂ عرب کے مطابق صرف کثرت اور بہتات مُراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بہت زیادہ شعبے ہیں۔

اور ایک قرینہ اسکا یہ بھی ہے کہ اگر سے آپ کا مطلب کوئی معین عدد نہیں ہوتا تو پھر آپ اس ابہام واجمال پر اکتفا نہ فرماتے، بلکہ اُنکی تفصیل بھی فرماتے، جیسا کہ موقع اور مقام کا تقاضا تھا۔

ایمان کے شعبوں سے مُراد وہ تمام اعمال و اخلاق اور ظاہری و باطنی وہ سب احوال ہیں جو کسی دل میں ایمان کے آجانے کے بعد اُسکے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر اُس میں پیدا ہو جانے چاہئیں، جیسے کہ سرسبز و شاداب درخت میں برگ و بار نکلتے ہیں، اس طرح گویا تمام اعمالِ خیر، اخلاقِ حسنہ اور احوالِ صالحہ ایمان کے شعبے ہیں، البتہ ان کے درجے مختلف ہیں۔

اس حدیث میں ایمان کا سب سے اعلیٰ شعبہ یعنی توحید کی شہادت کو بتایا گیا ہے، اور اُسکے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی چیز راستے سے تکلیف پہنچانے والی چیزوں کے ہٹانے کو قرار دیا ہے، اب انکے درمیان جس قدر بھی اُمور، خیر کا تصور کیا جا سکتا ہے، وہ سب ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، اور ظاہر ہے کہ ان کا عدد سینکڑوں تک پہنچے گا۔

حدیث کے آخر میں حیا کے متعلق جو خصوصیت سے یہ فرمایا گیا ہے کہ تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ جس موقع پر رسول اللہ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، اس وقت کسی سے حیا میں کوئی

[1] ذكره العينى فى العمدة والقارى فى المرقاة ۱۲

[2] ان کوششوں کے کچھ نتائج صحیح بخاری کی شروح فتح الباری اور عمدۃ القاری وغیرہ میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۲

کوتاہی ظاہر ہوئی تھی اسکی اصلاح کیلئے آپ نے یہ خصوصی انتباہ فرمایا، جیسا کہ صاحب حکمت معلمین و مصلحین کا طریقہ ہوتا ہے یا حیا کے متعلق خصوصیت سے یہ تنبیہ اسلئے فرمائی گئی، کہ انسانی اخلاق میں حیا کا مقام نہایت بلند ہے، اور حیا ہی وہ خصلت ہے جو آدمی کو بہت سے معاصی اور بہت سی برائیوں سے روکتی ہے، اور اس وجہ سے ایمان اور حیا کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ حیا صرف اپنے ہم جنسوں ہی سے نہیں کی جاتی، بلکہ سب سے زیادہ جس کی حیا ہم کو ہونی چاہئے، وہ ہمارا خالق و پروردگار حق تعالیٰ ہے، عام لوگ بڑا بے حیا اور بے ادب اس کو سمجھتے ہیں جو اپنے بڑوں کا پاس لحاظ نہ کرے، اور ان کے سامنے بے حیائی کے کام اور بری باتیں کرے، لیکن فی الحقیقت سب سے بڑا بے حیا وہ بد بخت انسان ہے جو اپنے مولا سے نہیں شرماتا، اور یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت مجھے اور میرے فعلوں کو بے حجاب دیکھتا اور میری باتوں کو بلا واسطہ سنتا ہے، اسکے سامنے وہ برے کام اور ناروا حرکتیں کرتا ہے۔

پس اگر آدمی میں حیا کا خلق پوری طرح بیدار اور کار فرما ہو، تو نہ صرف یہ کہ اسکے ہم جنسوں کی نظروں میں اسکی زندگی پاکیزہ اور ستھری ہوگی، بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معصیات کا صدور بھی بہت کم ہوگا۔

جامع ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ قَالُوْا اِنَّا نَسْتَحْيِىْ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ فَقَالَ لَيْسَ ذَالِكَ وَلٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ اَنْ تَحْفَظَ الرَّاسَ وَمَاحَوىٰ وَالْبَطْنَ وَمَا وَعىٰ وَتَذْكُرَ الْمَوْتَ وَالْبَلىٰ فَمَنْ فَعَلَ ذَالِكَ فَقَدْ، اِسْتَحْيَا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ"

اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اس سے حیا کرنی چاہئے مخاطبین نے عرض کیا: الحمد للہ ہم خدا سے حیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو، اور پیٹ کی، اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے اس سب کی نگرانی کرو (یعنی برے خیالات سے دماغ کی، اور حرام و ناجائز غذا سے پیٹ کی حفاظت کرو) اور موت، اور موت کے بعد قبر میں تمہاری جو حالت ہونی ہے اس کو یاد رکھو، جس نے یہ سب کچھ کیا، سمجھو کہ اللہ سے حیا کرنے کا حق اس نے ادا کیا۔

ایمان کے بعض آثار و ثمرات

۲۹) **عَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مَاالْاِيْمَانُ؟ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَ تْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)۔** (رواہ احمد)

حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج و قلق ہو، تو تم مؤمن ہو۔

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ ایمان کے خاص آثار اور علامات میں سے یہ ہے کہ آدمی جب کوئی نیک

عمل کرے، تو اُسکے دل کو فرحت و مسرت ہو، اور جب اس سے کوئی برا کام سرزد ہو جائے تو اسکو رنج و غم ہو، جب تک آدمی کے ضمیر میں یہ حس باقی رہے، سمجھنا چاہئے کہ ایمانی روح زندہ ہے اور یہ احساس اسکا ثمرہ ہے۔

ایمان کے کچھ خاص ثمرات اور اس کی خاص علامات و لوازم

(۳۰) عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِىَ بِاللهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ: ایمان کا مزہ اُسنے چکھا، اور اُس کی لذت اُسے ملی، جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا رسول اور ہادی ماننے پر دل سے راضی ہو گیا۔

تشریح ..... اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جس طرح لذیذ اور ذائقہ دار مادی غذاؤں میں ایک لذت ہوتی ہے، جس کو صرف وہی آدمی پا سکتا ہے جس کی قوتِ ذائقہ کسی بیماری کی وجہ سے ماؤف اور خراب نہ ہوئی ہو، اسی طرح ایمان میں ایک خاص لذت اور حلاوت ہے، لیکن وہ اُن ہی خوش قسمت لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جنہوں نے پوری خوش دلی اور رضائے قلبی کے ساتھ اللہ کو اپنا مالک اور پروردگار، اور حضرت محمد ﷺ کو نبی و رسول اور اسلام کو اپنا دین اور زندگی کا دستور بنا لیا ہو، اور اللہ کی بندگی، حضرت محمدؐ کی اطاعت اور طریقہ اسلام کی پیروی کو اُنکے دل نے اپنا لیا ہو، یعنی اللہ و رسول اور اسلام کیساتھ اُن کا تعلق محض رسمی اور موروثی یا محض عقلی اور دماغی نہ ہو، بلکہ اُن کے ساتھ دلی گرویدگی ہو۔ اسی حدیث میں [illegible] کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جسکو یہ نصیب نہیں، یقیناً ایمانی لذت و حلاوت میں بھی اُس کا کوئی حصہ نہیں اور اس کا ایمان کامل نہیں۔

(۳۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَّكُوْنَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَّكْرَهَ اَنْ يَّعُوْدَ فِى الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّقْذَفَ فِى النَّارِ۔ (رواه البخارى و مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایمان کی حلاوت اسی کو نصیب ہوگی، جس میں تین باتیں پائی جائیں گی: ایک یہ کہ اللہ و رسول کی محبت اُس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ جس آدمی سے بھی اُسکو محبت ہو صرف اللہ ہی کیلئے ہو، اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹنے سے اُسکو اتنی نفرت اور ایسی اذیت ہو جیسی کہ آگ میں ڈالے جانے سے ہوتی ہے۔

تشریح ..... اس حدیث کا مضمون بھی قریب قریب ہی ہے، جو اس سے پہلی والی حدیث کا تھا، صرف تعبیر کا تھوڑا سا فرق ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ایمان کی حلاوت اُسی آدمی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اللہ و رسول کی محبت میں ایسا سرشار ہو کہ ہر چیز سے زیادہ اُس کو اللہ و رسول کی محبت ہو اور اس محبت کا اُسکے دل پر ایسا قبضہ اور تسلّط ہو کہ اگر کسی اور سے وہ محبت بھی کرے تو اللہ ہی کیلئے کرے اور اللہ کا دین اسلام اُس کو اتنا عزیز اور پیارا ہو کہ اُس سے پھرنے اور اُس کو چھوڑنے کا خیال اُس کیلئے آگ میں گر جانے کے برابر تکلیف دہ ہو۔

۳۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اُس کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل جب ہی ہو سکتی ہے اور ایک مسلمان پورا مؤمن تب ہی ہو سکتا ہے، کہ دنیا کے تمام دوسرے آدمیوں سے حتی کہ اپنے ماں باپ، اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ اس کو رسول اللہ (ﷺ) کی محبت ہو۔

اس سے پہلی حدیث میں تمام ماسواے زیادہ اللہ و رسول کی محبت اور اسلام کی محبت کو "حلاوتِ ایمانی" حاصل ہونے کی شرط بتلایا گیا تھا، اور اس حدیث میں صرف رسول اللہ ﷺ کی محبت کا ذکر فرمایا گیا ہے...... بات یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اور اسلام کی محبت میں باہم ایسا تعلق ہے کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر ہرگز نہیں پائی جاسکتیں، اللہ تعالیٰ سے اور اسلام سے صحیح محبت بغیر رسول کی محبت کے ناممکن ہے، اور اسی طرح اللہ کی اور اسلام کی محبت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تصور نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اللہ کے رسول سے جو محبت بحیثیت رسول کے ہوگی، وہ درحقیقت اللہ ہی کی وجہ سے اور اللہ ہی کے تعلق سے ہوگی، اور اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام سے بھی پوری محبت ہوگی، اسلئے اس حدیث میں کمالِ ایمان کی شرط کے طور پر صرف رسول اللہ ﷺ کی محبت کا ذکر کر دیا گیا ہے لیکن مطلب وہی ہے کہ ایمانی انوار و برکات صرف اُن ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہو سکتے ہیں، جن کے دلوں پر اللہ و رسول کی اور اسلام کی محبت کا ایسا غلبہ ہو کہ دوسری تمام محبتیں اس سے دبی ہوئی ہوں۔

ان حدیثوں میں اللہ و رسول کی محبت کا جو مطالبہ کیا گیا ہے، اس کی مراد متعین کرنے میں شارحین حدیث کا کلام کچھ مختلف سا ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے ان کا مطلب و مقصد سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، حالانکہ جو حقیقت ان حدیثوں میں بیان کی گئی ہے وہ بالکل صاف اور سادہ ہے، محبت ایک معروف لفظ ہے، اور اسکے معنی بھی معروف و معلوم ہیں، اور وہی یہاں بھی مراد ہیں، البتہ اللہ و رسول کے ساتھ اہلِ ایمان کو جو محبت ہوتی ہے وہ ماں باپ اور بیوی بچوں کی محبت کی طرح خونی رشتوں یا دوسرے طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ روحانی اور عقلی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور جب وہ کامل ہو جاتی ہے تو اسکے سوا دوسری وہ تمام محبتیں جو طبعی یا نفسانی اسباب کی وجہ سے ہوتی ہیں اُس سے مغلوب ہو جاتی ہیں، اور اس بات کو ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے، جس کو اللہ نے اس کا کوئی حصہ نصیب فرمایا ہو۔

الغرض ان احادیث میں محبت سے مراد دل کی وہی خاص کیفیت ہے جسکو محبت کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، اور اُسی کا ہم سے مطالبہ ہے، اور وہی گویا ہمارے ایمان کی جان ہے، قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ [illegible]

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ.

اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا کنبہ، قبیلہ اور تمہارا وہ مال و دولت جسکو تم نے محنت سے کمایا ہے، اور تمھاری وہ چلتی ہوئی تجارت جسکی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو، اور تمھارے رہنے کے وہ اچھے مکانات جو تم کو پسند ہیں (پس اگر دنیا کی یہ محبوب و مرغوب چیزیں) اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کے دین کی راہ کی جدوجہد سے زیادہ تم کو محبوب ہیں، تو انتظار کرو، تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور فیصلہ نافذ کرے، اور یاد رکھو کہ اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ (التوبہ ۹:۲۴)

پس قرآن مجید کی اس پُر جلال آیت کا تقاضا اور مطالبہ بھی یہی ہے کہ ایمان والوں کو اپنی تمام قابلِ محبت چیزوں سے زیادہ، اللہ و رسول کی اور اسکے دین کی محبت ہونی چاہئے! اسکے بغیر اللہ کی رضا اور اُس کی خاص ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی، اور ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کو یہ دولت نصیب ہو جائے اس کیلئے ایمان کے سارے تقاضوں کا پورا کرنا اور اللہ و رسول کے احکام پر چلنا نہ صرف یہ کہ آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس راہ میں جانِ عزیز تک دے دینے میں بھی وہ ایک لذت محسوس کرے گا، اور اسکے بر خلاف جس کے دل پر اللہ و رسول کی محبت کا ایسا غلبہ نہ ہوگا، اس کے لئے روز مرہ کے اسلامی فرائض کی ادائیگی اور عام ایمانی مطالبات کی تعمیل بھی سخت گراں اور بڑی کٹھن ہوگی اور جتنا کچھ وہ کرے گا بھی، تو اُس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس قانونی پابندی کی سی ہوگی، پس اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ، جب تک اللہ و رسول کی محبت دوسری ساری چاہتوں اور محبتوں پر غالب نہ ہو جائے، ایمان کا اصل مقام نصیب نہیں ہو سکتا، اور ایمان کی حلاوت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا حُبَّكَ وَحُبَّ رَسُوْلِكَ وَ حُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنَا اِلٰى حُبِّكَ.

۳۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ ...... رَوَاهُ الْبَغَوِيُّ فِيْ شَرْحِ السُّنَّه۔ [1]

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اُسکی ہوائے نفس میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائے۔ (شرح السنہ)

تشریح ...... مطلب یہ ہے کہ حقیقی ایمان جب ہی حاصل ہو سکتا ہے اور ایمانی برکات تب ہی نصیب ہو سکتی ہیں، کہ آدمی کے نفسی میلانات اور اُسکے جی کی چاہتیں کلی طور پر ہدایاتِ نبوی کے تابع اور ماتحت ہو جائیں۔

[1] قال في المشكوة، قال النووي في اربعينه هذا حديث صحيح رويناه في كتاب الحجة باسناد صحيح۔ ۱۲

ھوی (یعنی خواہشات نفس) اور ھدی (یعنی انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایات) یہی دو چیزیں ہیں جن پر خیر و شر کے سارے سلسلہ کی بنیاد ہے، اور جن سے انسانوں کی سعادت یا شقاوت وابستہ ہے، ہر گمراہی اور بدعملی اتباع ھوی کا نتیجہ ہے، جس طرح کہ ہر خیر اور ہر نیکی اتباعِ ھُدیٰ سے پیدا ہوتی ہے، لہذا حقیقی ایمان جب ہی نصیب ہو سکتا ہے کہ ھوی کو (یعنی اپنے نفس کی چاہتوں کو) ھُدیٰ کے (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات و تعلیم کے) تابع کر دیا جائے اور جس نے ھُدیٰ کو چھوڑ کر ھوی کی غلامی اختیار کی اور بجائے ربانی ہدایت کے وہ نفسانی خواہشات کے تابع ہو گیا، تو گویا خود ہی اُس نے مقصد ایمان کو پامال کر دیا۔

قرآن پاک میں ایسوں ہی کے متعلق فرمایا گیا ہے، کہ انھوں نے خواہشاتِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (فرقان ۲۵ : ۴۳)

کیا تم نے ان بدبختوں کو دیکھا، جنھوں نے اپنے نفس کی خواہشوں کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (قصص ۲۸ : ۵۰)

جو شخص اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنے جی کی چاہت پر چلے اس سے زیادہ گمراہ اور غلط اور کون ہو سکتا ہے، اللہ ظالم لوگوں کو اپنی راہ پر نہیں لگاتا۔

(۳۴) عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔
(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنے بھائی کیلئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے"۔

تشریح ... مطلب یہ ہے کہ ایمان کے اصل مقام تک پہنچنے کیلئے اور اسکی خاص برکتیں حاصل کرنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی خودغرضی سے پاک ہو اور اسکے دل میں اپنے دوسرے بھائیوں کیلئے اتنی خیرخواہی ہو، کہ جو نعمت اور جو بھلائی اور جو بہتری وہ اپنے لئے چاہے، وہی دوسرے بھائیوں کیلئے بھی چاہے، اور جو بات اور جو حال وہ اپنے لئے پسند نہ کرے، اس کو کسی دوسرے کیلئے بھی پسند نہ کرے، اسکے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

اسی حدیث کی ابن حبان کی روایت میں "لا یؤمن احدکم" کی جگہ "لا یبلغ العبد حقیقة الایمان" روایت کیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس حدیث میں اور اس جیسی دوسری حدیثوں میں بھی "لا یؤمن" کے لفظ سے ایمان کی قطعی نفی مراد نہیں ہے، بلکہ کمال کی نفی مقصود ہے۔ اور اس طرح ناقص کو کالمعدوم قرار دے کر اسکی نفی کر دینا قریباً ہر زبان کا عام محاورہ ہے، مثلاً ہماری اردو زبان میں بھی کسی برے اور غلط آدمی کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ "اس میں تو انسانیت ہی نہیں ہے" یا کہہ دیتے ہیں کہ "وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے"۔ حالانکہ مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اچھا اور معقول آدمی نہیں ہے۔ بس اسی طرح بہت سی حدیثوں میں بھی ایمان کے نقص کو "لا ایمان" یا "لا یؤمن" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تربیت و نصیحت

(جو ان حدیثوں کا مقصد ہے) اُس کیلئے یہی طرزِ بیان مناسب تر اور بہتر بھی ہے .... ایسے موقع پر منطقیوں والی موشگافیاں کرنا مزاجِ نبوت سے ناآشنائی کی دلیل اور بڑی ہی بدذوقی کی بات ہے۔

۳۵) **عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَفْضَلِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَ تُبْغِضَ لِلّٰهِ وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ قَالَ وَمَا ذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَ تَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ۔** (رواه احمد)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے افضل ایمان کے متعلق سوال کیا (یعنی پوچھا کہ ایمان کا اعلیٰ اور افضل درجہ کیا ہے؟ اور وہ کون سے اعمال و اخلاق ہیں جن کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے) تو آپ نے ارشاد فرمایا .... یہ کہ بس اللہ ہی کیلئے کسی سے تمہاری محبت ہو، اور اللہ ہی کے واسطے بغض و عداوت ہو (یعنی دوستی اور دشمنی جس سے بھی ہو، صرف اللہ کے واسطے ہو) اور دوسرے یہ کہ اپنی زبان کو تم اللہ کی یاد میں لگائے رکھو"۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: اور کیا یا رسول اللہ! "آپ نے فرمایا: اور یہ کہ دوسرے لوگوں کیلئے بھی وہی چاہو، اور وہی پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے اور چاہتے ہو، اور ان کیلئے بھی اُن چیزوں کو ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔"

تشریح .... حضرت معاذؓ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں تین چیزوں کو ذکر فرمایا ہے، اور بتلایا ہے کہ کامل ایمان جب نصیب ہوگا، جبکہ یہ تین باتیں پیدا ہو جائیں۔ ایک اللہ ہی کے لئے دوستی اور دشمنی، دوسرے زبان کا یادِ الٰہی میں مشغول رکھنا، تیسرے بندگانِ خدا کی ایسی خیر خواہی کہ جو اپنے لئے چاہے، وہ سب کیلئے چاہے اور جو اپنے لئے نہ چاہے وہ کسی کے لئے نہ چاہے۔

۳۶) **عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔** (رواه ابو داؤد)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے دشمنی کی، اور اللہ ہی کیلئے دیا (جس کو جو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے واسطے منع کیا، اور نہ دیا (جس کو منع کرنا، اور نہ دینا عند اللہ بہتر سمجھا) تو اسنے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

تشریح .... مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے حرکات و سکنات اور اپنے جذبات کو اسی طرح مرضیِ الٰہی کے تابع کر دیا کہ وہ جس سے تعلق جوڑتا ہے اللہ ہی کی رضا کے لئے جوڑتا ہے، اور جس سے توڑتا ہے اللہ ہی کے لئے توڑتا ہے جس کو دیتا ہے اللہ ہی کیلئے دیتا ہے اور جس کے دینے سے ہاتھ روکتا ہے صرف اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے روکتا ہے، غرض جس کے ایجابی اور سلبی قلبی رجحانات اور جذبات مثلاً محبت اور عداوت، اور اسی طرح مثبت و منفی اور ظاہری افعال و حرکات مثلاً کسی کو کچھ دینا یا نہ دینا، یہ سب اللہ ہی کے واسطے ہونے لگیں، اور بجز رضاءِ الٰہی کے کوئی اور محرک اور داعیہ اُسکے اعمال و افعال کے لئے نہ رہے، الغرض تعلق باللہ اور کامل عبدیت کا یہ مقام جس کو حاصل ہو جائے اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِاَبِىْ ذَرٍّ اَىُّ عُرَى الْاِيْمَانِ اَوْثَقُ؟ قَالَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ الْمُوَالَاةُ فِى اللهِ وَالْحُبُّ فِى اللهِ وَالْبُغْضُ فِى اللهِ.

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوذر غفاریؓ سے فرمایا: "بتاؤ ایمان کی کون سی دست آویز زیادہ مضبوط ہے؟" (یعنی ایمان کے شعبوں میں سے کون سا شعبہ زیادہ پائیدار ہے) ابوذر نے عرض کیا، کہ "اللہ و رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔" (لہٰذا حضور ﷺ ہی ارشاد فرمائیں) آپ نے فرمایا: "اللہ کے لئے باہم تعلق و تعاون، اور اللہ واسطے کی کسی سے محبت، اور اللہ ہی کے واسطے کسی سے بغض و عداوت۔"

ف..... مطلب یہ ہے کہ ایمانی اعمال و احوال میں سب سے زیادہ جاندار اور پائیدار عمل اور حال یہ ہے کہ بندہ کا دنیا میں جس کے ساتھ جو برتاؤ ہو، خواہ موالات ہو یا ترک موالات، محبت ہو یا عداوت، وہ اپنے نفس کے تقاضے سے اور کسی نفسانی جذبہ سے نہ ہو، بلکہ صرف اللہ کے لئے اور اسی کے حکم کے ماتحت ہو۔

۸) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَىْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ.

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ صاحب ایمان نہ ہو جاؤ اور تم پورے مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم میں باہم محبت نہ ہو، کیا میں تم کو ایک ایسی بات نہ بتلا دوں، کہ اگر اس پر عمل کرنے لگو، تو تم میں باہمی محبت پیدا ہو جائے، وہ بات یہ ہے کہ تم اپنے درمیان سلام کا رواج پھیلاؤ اور اس کو عام کرو۔"

ف..... اوپر کی حدیثوں سے معلوم ہوا تھا کہ بندہ کے ایمان کی تکمیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسکو اللہ و رسول کے ساتھ اور ان کے دین کے ساتھ تمام ماسوا سے زیادہ محبت ہو، اور ان کے سوا جس سے بھی محبت ہو ان ہی کے تعلق سے اور ان ہی کے واسطے ہو، اور یہ کہ بندہ کا دل خود غرضی سے بالکل پاک صاف ہو، اور اس کا حال یہ ہو کہ جو اپنے لئے چاہے وہی اللہ کے دوسرے بندوں کے لئے بھی چاہے، اور جس چیز کو اپنے لئے پسند نہ کرے اس کو کسی دوسرے کیلئے بھی پسند نہ کرے..... اب اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والی کسی قوم اور کسی معاشرہ کے ایمان کی تکمیل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن میں باہم محبت و مودت ہو، اگر ان کے دل ایک دوسرے کی محبت سے خالی ہیں، تو سمجھنا چاہئے کہ وہ حقیقتِ ایمان اور اُس کے برکات و ثمرات سے بے نصیب ہیں۔

۹) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ. (رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: "مسلم وہ ہے جسکی زبان درازیوں اور دست درازیوں سے مسلمان محفوظ رہیں، اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں لوگوں کو کوئی خوف

وخطر نہ ہو"۔

تشریح ...... اس حدیث میں صرف زبان اور ہاتھ سے ایذا رسانی کا ذکر اسلئے فرمایا گیا ہے کہ بیشتر ایذاؤں کا تعلق ان ہی دو سے ہوتا ہے، ورنہ مقصد اور مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ لوگوں کو اس سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔

ابن حبان کی اسی حدیث کی روایت میں "من سلم المسلمون" کے بجائے "من سلم الناس من لسانه ویده" وارد ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو تمام بنی نوع انسان کے لئے پُر امن اور بے آزار ہونا چاہئے۔

لیکن واضح رہے کہ اس حدیث میں جس ایذا رسانی کو منافی اسلام بتلایا گیا ہے، وہ وہ ہے جو بغیر کسی صحیح وجہ اور معقول سبب کے ہو، ورنہ بشرط قدرت مجرموں کو سزا دینا، اور ظالموں کی زیادتیوں اور مفسدوں کی فساد انگیزیوں کو بزور دفع کرنا تو مسلمانوں کا فرض منصبی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے، تو دنیا امن و راحت سے محروم ہو جائے۔

۴۰) عَنْ اَبِیْ شُرَیْحِ الْخُزَاعِیْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ وَمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ ابو شریح خزاعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قسم اللہ کی وہ مؤمن نہیں، قسم اللہ کی وہ مؤمن نہیں، قسم اللہ کی وہ مؤمن نہیں"۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کون مؤمن نہیں؟ آپ نے فرمایا "وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور آفتوں سے خائف رہتے ہوں"۔ (بخاری)

تشریح ...... یعنی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک اور ایسا شریفانہ برتاؤ کہ ان کو ہماری طرف سے پورا اطمینان رہے، اور ہماری جانب سے کسی ظلم اور شرارت کا اندیشہ اُن کے دلوں میں نہ رہے، یہ ایمان کے اُن شرائط اور لوازم میں سے ہے جن کے بغیر ایمان گویا کالعدم ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا۔ (مسند احمد، ترمذی)

اپنے پڑوسی کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو تب تم ایمان والے ہو۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے:

مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یُؤْذِ جَارَهٗ. (بخاری و مسلم)

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو (اور اسلئے اللہ کی رضا اور آخرت میں فلاح چاہتا ہو) تو اسے لازم ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو نہ ستائے۔

۴۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِهٖ. (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ "وہ شخص مؤمن نہیں ہے کہ جو خود شکم سیر ہو کر کھائے اور اسکے برابر میں رہنے والا اس کا پڑوسی فاقہ سے ہو۔

تشریح ...... یعنی اپنے پڑوسی کی بھوک اور فاقہ سے بے نیاز اور لاپروا ہو کر اپنا پیٹ بھرنے والا آدمی (اگرچہ وہ ستّر پشتوں کا مسلمان ہو) حقیقتِ ایمان سے بے نصیب ہے، اور سنگدلی اور خود غرضی کی یہ کیفیت شانِ ایمان کے بالکل منافی ہے۔

(ہم مسلمانوں کا اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اور عام بندگانِ خدا کے ساتھ جو معاملہ اور برتاؤ ہے اس کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں ذرا ہم اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ کی ان احادیث کی رو سے ہمارا مقام کیا ہے اور ہم کہاں ہیں)۔

۴۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔

(رواہ ابو داؤد والدارمی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمانوں میں زیادہ کامل ایمان اُس کا ہے جس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔"

تشریح ...... مطلب یہ ہے کہ کمالِ ایمان کا انحصار حسنِ اخلاق پر ہے، پس اخلاق میں جو جتنا بلند ہوگا، اسی قدر اس کا ایمان کامل ہوگا، یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ حسنِ اخلاق کمالِ ایمان کا لازمی نتیجہ اور ثمرہ ہے، لہٰذا جس شخص کا ایمان جتنا کامل ہوگا، اُسی کی نسبت سے اُسکے اخلاق بلند ہونگے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص کو ایمان کی حقیقت تو نصیب ہو، لیکن اُسکے اخلاق اچھے نہ ہوں۔

۴۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ۔

(رواہ ابن ماجہ والترمذی والبیہقی فی شعب الایمان)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہےکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آدمی کے اسلام کی خوبی اور اسکے کمال میں یہ بھی داخل ہےکہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں اور باتوں کا تارک ہو۔"

تشریح ...... انسان اشرف المخلوقات ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت قیمتی بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کو اس وقت کا اور صلاحیتوں کا جو سرمایا دیا گیا ہے، وہ اس کو بالکل ضائع نہ کرے، بلکہ صحیح طور سے اسکو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ ترقی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قُرب حاصل کرے...... یہی دین کی تمام تعلیمات کا حاصل اور لبِ لباب ہے، اور یہی ایمان و اسلام کا مقصد ہے، اسلئے جو خوش نصیب یہ چاہے کہ اُس کو ایمان کا کمال حاصل ہو اور اُسکے اسلام کے حسن پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو، تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ کھلے گناہوں اور بداخلاقیوں کے علاوہ تمام فضول اور غیر مفید کاموں اور باتوں سے بھی اپنے کو بچائے رکھے، اور اپنے وقت اور اپنی تمام خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کو بس ان ہی کاموں میں لگائے جن میں خیر اور منفعت کا کوئی پہلو ہو، یعنی جو معاد یا معاش کے لحاظ سے ضروری یا مفید ہوں...... یہی اس حدیث کا مطلب ہے۔

جو لوگ غفلت سے لا یعنی باتوں اور بے حاصل چیزوں میں اپنا وقت اور اپنی توتیں صرف کرتے ہیں، وہ نادان جانتے نہیں کہ اللہ نے ان کو کتنا قیمتی بنایا ہے، اور وہ اپنے کیسے بیش بہا خزانہ کو مٹی میں ملاتے ہیں، اس حقیقت کو جنھوں نے سمجھ لیا ہے، بس وہی دانا اور عارف ہیں۔

۴۴) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَیْسَ وَرَاءَ ذَالِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ نے جو پیغمبر بھی مجھ سے پہلے کسی امت میں بھیجا تو اسکے کچھ حواری اور لائق اصحاب ہوتے تھے، جو اسکے طریقے پر چلتے، اور اسکے حکم کی پیروی کرتے تھے، پھر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے نالائق پسماندگان ان کے جانشین ہوتے تھے، اور ان کی حالت یہ ہوتی تھی کہ وہ کہتے تھے اور خود وہ کام نہیں کرتے تھے، یا مطلب یہ ہے کہ کرنے کے جو کام، وہ نہیں کرتے تھے ان کے متعلق لوگوں سے کہتے تھے، کہ ہم کرتے ہیں، گویا اپنی مشیخیت اور اپنا تقدس قائم رکھنے کیلئے وہ جھوٹ بھی بولتے) اور جن کاموں کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا، ان کو کرتے تھے (یعنی اپنے پیغمبر کی سنتوں اور اسکے اوامر واحکام پر تو وہ عامل نہ تھے، مگر وہ معصیات و بدعات جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا ان کو خوب کرتے تھے۔) تو جس نے ان کے خلاف اپنے دست و بازو سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے، اور جس نے (بدرجہ مجبوری) صرف زبان ہی سے ان کے خلاف جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے، اور جس نے (جہاد باللسان سے بھی عاجز رہ کر) صرف دل ہی سے ان کے خلاف جہاد کیا (یعنی دل میں ان سے نفرت کی اور ان کے خلاف غیظ و غضب رکھا) تو وہ بھی مؤمن ہے، لیکن اسکے بغیر رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

تشریح...... حدیث کا مطلب اور اسکی روح یہی ہے کہ انبیاء اور بزرگان دین کے جانشینوں اور نام لیواؤں میں جو غلط کار اور بد کردار ہوں، جو دوسروں کو تو اعمال خیر کی دعوت دیتے ہوں، لیکن خود بے عمل اور بدعمل ہوں، انکے خلاف حسب استطاعت ہاتھ سے یا زبان سے جہاد کرنا اور کم از کم دل میں اس جہاد کا جذبہ رکھنا ایمان کے خاص شرائط اور لوازم میں سے ہے، اور جو شخص اپنے دل میں بھی اس جہاد کا جذبہ نہ رکھتا ہو، اس کا دل ایمان کی حرارت اور اسکے سوز سے گویا بالکل ہی خالی ہے...... لیس وراء ذالك من الایمان حبة خردل کا یہی مطلب ہے، اور اگلی حدیث میں اسی کو "اضعف الایمان" (ایمان کا ضعیف ترین درجہ) فرمایا گیا ہے۔

ملحوظ رہے کہ اس حدیث میں انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے ناخلف اور نالائق جانشینوں کے خلاف جہاد کا جو حکم ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو درست کرنے کی اور صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی جائے اور اگر اس سے مایوسی ہو تو ان کے برے اثرات سے اللہ کے بندوں کو بچانے کے لئے ان کی

جھوٹی مشیخت اور ان کے موروثی اثر و اقتدار کو ختم کرنے کی جد و جہد کی جائے۔

۴۵) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِی عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذَالِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی تم میں سے کوئی بری اور خلاف شرع بات دیکھے، تو لازم ہے کہ اگر طاقت رکھتا ہو، تو اپنے ہاتھ سے (یعنی زور و قوت سے) اس کو بدلنے کی (یعنی درست کرنے کی) کوشش کرے، اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو پھر اپنی زبان سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل ہی سے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ (مسلم)

تشریح ...... اس سے پہلی حدیث میں ایک خاص طبقے کی بدکاری اور بدکرداری کے خلاف حسب استطاعت جد و جہد کو لازمۂ ایمان قرار دیا گیا تھا، اور اس حدیث میں ہر برائی اور ہر شرارت کو روکنے اور اس کو بدل ڈالنے کی بقدر استطاعت سعی و کوشش کا عام حکم فرمایا گیا ہے، اور اوپر والی حدیث کی طرح یہاں بھی اسکے تین درجے بتلائے گئے ہیں۔

۱۔ اگر طاقت و اقتدار حاصل ہو اور اسکے ذریعہ اس برائی کو روکا جا سکتا ہو، تو طاقت استعمال کر کے اسکو روکا جائے۔

۲۔ اگر طاقت و اقتدار اپنے ہاتھ میں نہیں ہے تو زبانی افہام و تفہیم اور پند و نصیحت ہی سے اس کو روکنے کی اور اصلاح کی کوشش کی جائے۔

۳۔ اگر حالات ایسے ناموافق ہیں اور اہل دین اس قدر کمزور پوزیشن میں ہیں کہ اس برائی کے خلاف زبان کھولنے کی بھی گنجائش نہیں ہے، تو آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کو برا سمجھا جائے اور اس کو مٹانے اور بدل ڈالنے کا جذبہ دل میں رکھا جائے، جس کا فطری نتیجہ کم از کم یہ ہو گا کہ دل اللہ تعالیٰ سے اسکے مٹانے کی دعا کرتا رہے گا، اور تدبیریں بھی سوچا کرے گا۔ اس آخری درجے کو حدیث میں اضعف الایمان فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمان کا وہ آخری کمزور درجہ ہے، کہ اسکے بعد کوئی اور درجہ ایمان کا ہے ہی نہیں، یہی بات پہلی حدیث میں دوسرے لفظوں میں فرمائی گئی تھی۔

اس حدیث کی رو سے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جو برائیاں اسکے سامنے اس قسم کی ہوں، جو زور و قوت سے روکی جا سکتی ہوں، تو اگر اس کو وہ زور و قوت حاصل ہو تو اس کو استعمال کر کے وہ اس برائی کو روکنے کی کوشش کرے، اور اگر زور قوت ہاتھ سے خالی ہو تو پھر زبانی افہام و تفہیم سے کام لے، اور اگر حالات میں اس کی بھی گنجائش نہ ہو تو پھر کم از کم دل میں اسکے خلاف جذبہ اور سوزش ہی رکھے۔

۴۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَّا قَالَ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَہٗ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا ہو، اور اس میں یہ

نہ ارشاد فرمایا ہو کہ: "جس میں امانت کی خصلت نہیں اُس میں ایمان نہیں، اور جس میں عہد کی پابندی نہیں، اس میں دین نہیں۔
(شعب الایمان للبیہقی)

تشریح..... یعنی امانت داری اور عہد کی پابندی سے کسی آدمی کا خالی ہونا دین وایمان کی حقیقت سے اسکی محرومی اور بے نصیبی کی دلیل ہے، کیونکہ امانت اور ایفاء عہد ایمان واسلام کے لوازم میں سے ہیں..... جیسا کہ پہلے بھی بعض حدیثوں کی تشریح میں لکھا جاچکا ہے، اس طرح کی حدیثوں کا مقصد ومنشا یہ نہیں ہوتا کہ ایسا شخص اسلام کے دائرے سے بالکل نکل گیا، اور اب اُس پر بجائے اسلام کے کفر کے احکام جاری ہوں گے، بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ایمان کی اصل حقیقت اور اسکے نور سے بے نصیب ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس کا ایمان بہت ہی ناقص درجے کا، اور بے جان ہے۔

ایمان میں خرابی ڈالنے والے اخلاق و اعمال!

۴۷) عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ. (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ بہز بن حکیم اپنے والد حکیم کے واسطے سے اپنے دادا معاویہ بن حیدہ قشیری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "غصہ ایمان کو ایسا خراب کردیتا ہے جیسے کہ ایلوا شہد کو خراب کردیتا ہے۔"
(شعب الایمان للبیہقی)

تشریح..... در حقیقت غصہ ایسی ہی ایمان سوز چیز ہے، جب آدمی پر غصہ سوار ہوتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود سے وہ تجاوز کرجاتا ہے، اور اس سے وہ باتیں اور وہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جو اُسکے دین کو برباد کر دیتی ہیں اور اللہ کی نظر سے اُس کو گرا دیتی ہیں۔

۴۸) عَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ اوس بن شرحبیل سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کیلئے، اور اُس کا ساتھ دینے کے لئے چلا اور اُس کو اس بات کا علم تھا کہ یہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

تشریح..... جب ظلم کا ساتھ دینا، اور ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اُس کی کسی قسم کی مدد کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو اسلام سے نکل جانے والا قرار دیا ہے، تو سمجھا جاسکتا ہے کہ خود ظلم ایمان و اسلام کے کس قدر منافی ہے، اور اللہ ورسول کے نزدیک ظالموں کا کیا درجہ ہے۔

۴۹) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيْ۔ (رواه الترمذى والبيهقى فى شعب الايمان)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا، اور نہ فحش گو اور بدکلام ہوتا ہے۔"

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ بدکلامی اور فحش گوئی اور دوسروں کے خلاف زبان درازی، یہ عادتیں ایمان کے منافی ہیں، اور مسلمان کو ان سے پاک ہونا چاہئے۔

۵۰) **عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّهُ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا قَالَ لَا ۔**

(رواہ مالک والبیہقی فی شعب الایمان مرسلاً)

حضرت صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا، کہ: کیا مسلمان بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، "ہاں! (مسلمان میں یہ کمزوری ہو سکتی ہے)"۔ پھر عرض کیا گیا: کیا مسلمان بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! (مسلمان میں یہ کمزوری بھی ہو سکتی ہے)"۔ پھر عرض کیا گیا: کیا مسلمان کذاب (یعنی بہت جھوٹا) ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: "نہیں! (یعنی ایمان کے ساتھ بیباکانہ جھوٹ کی ناپاک عادت جمع نہیں ہو سکتی، اور ایمان جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا)۔"

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ بخل اور بزدلی اگرچہ بُری عادتیں ہیں، لیکن یہ دونوں انسان کی کچھ ایسی فطری کمزوریاں ہیں، کہ ایک مسلمان میں بھی یہ ہو سکتی ہیں، لیکن جھوٹ کی عادت میں اور ایمان میں ایسی منافات ہے، کہ یہ ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

۵۱) **عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لَا يَزْنِى الزَّانِىْ حِيْنَ يَزْنِىْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ فِيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ اَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاِيَّاكُمْ اِيَّاكُمْ ۔**　(رواہ البخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں زنا کرتا کوئی زناکار، جس وقت وہ زنا کرتا ہے اور وہ اُس وقت مومن ہو، اور نہیں چوری کرتا کوئی چور جسوقت وہ چوری کرتا ہے اور وہ اس وقت مومن ہو، اور نہیں شراب پیتا کوئی شرابی جبکہ وہ شراب پیتا ہے، اور وہ اُس وقت مومن ہو، اور نہیں لوٹتا لوٹ کا کوئی مال کہ لوگ اُس کی طرف آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر اُسکی لوٹ مار کو دیکھتے ہوں جبکہ وہ لوٹتا ہے، اور وہ اُس وقت مومن ہو، اور نہیں خیانت کرتا خیانت کرنے والا جبکہ وہ خیانت کرتا ہے اور وہ اُس وقت مومن ہو، پس (اے ایمان والو! ان منافی ایمان حرکات سے) اپنے کو بچاؤ! بچاؤ!

یہ حدیث بخاری و مسلم ہی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے بھی آئی ہے، اور اس میں زنا، چوری، شراب نوشی، لوٹ مار اور خیانت کے علاوہ قتل ناحق کا بھی ذکر ہے، یعنی اُس میں ان الفاظ کا اور اضافہ ہے: وَلَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (یعنی نہیں قتل کرتا کوئی قتل کرنے والا کسی کو جبکہ وہ

قتل کرتا ہے، اور وہ اُس وقت مؤمن ہو)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ زنا، چوری، شراب نوشی، قتل و غارت گری، اور خیانت، یہ سب حرکتیں ایمان کے قطعاً منافی ہیں، اور جس وقت کوئی شخص یہ حرکتیں کرتا ہے اُس وقت اُسکے دل میں ایمان کا نور بالکل نہیں رہتا، یہ مطلب نہیں ہے، کہ وہ اسلام کے دائرہ سے بالکل نکل کر کافروں میں شامل ہو جاتا ہے..... خود امام بخاریؒ نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَا يَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا يَكُوْنُ لَهٗ نُوْرُ الْإِيْمَانِ۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

ان گناہوں کا کرنے والا جس وقت کہ یہ گناہ کرتا ہے اُس وقت وہ پورا مؤمن نہیں ہوتا، اور اُس میں ایمان کا نور نہیں رہتا۔

اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ ایمان دل کی جس خاص کیفیت کا نام ہے، وہ اگر جاندار اور بیدار ہو اور دل اُس کے نور سے روشن ہو تو ہرگز آدمی سے ایسا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا، ایسے ناپاک گناہوں کے لئے آدمی کا قدم اُس وقت اُٹھ سکتا ہے جبکہ دل میں ایمان کی شمع روشن نہ ہو، اور وہ خاص ایمانی کیفیت غائب ہو گئی ہو، یا کسی وجہ سے بیجان اور مضمحل ہو گئی ہو جو آدمی کو گناہوں سے بچانے والی طاقت ہے۔

بہر حال حدیث پڑھنے والے کو یہ اصولی بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اس قسم کی حدیثیں جن میں خاص خاص بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے، کہ جو لوگ ان کے مُرتکب ہوں اُنمیں ایمان نہیں، یا یہ کہ وہ مؤمن نہیں، اور اسی طرح وہ حدیثیں جن میں بعض اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے، کہ جو شخص ان کا تارک ہو وہ ایمان سے خالی اور بے نصیب ہے، یا یہ کہ وہ مؤمن نہیں ہے" ان کا مقصد و منشا یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص دائرۂ اسلام سے بالکل نکل گیا، اور اب اُس پر اسلام کے بجائے کفر کے احکام جاری ہوں گے، اور آخرت میں اُس کے ساتھ ٹھیٹ کافروں والا معاملہ ہوگا، بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اُس حقیقی ایمان سے محروم اور بے نصیب ہے جو مسلمانوں کی اصلی شان ہے، اور جو اللہ کو محبوب ہے اور اس کے لئے نحوی ترکیب میں "کاملاً" یا "تاماً" جیسے الفاظ مقدر ماننے کی بالکل ضرورت نہیں، بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی بدذوقی ہے، ہر زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ اگر کسی میں کوئی صفت بہت ناقص اور کمزور درجہ کی ہو تو اُس کو کالعدم قرار دے کر اس کی مطلق نفی کر دی جاتی ہے خاص کر دعوت و خطابت اور ترغیب و ترہیب میں یہی طرز بیان زیادہ موزوں، اور زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے۔

مثلاً یہی حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے زنا اور چوری اور خونِ ناحق وغیرہ گناہوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "ان کا کرنے والا جس وقت یہ ناپاک کام کرتا ہے وہ اس وقت مؤمن نہیں ہوتا" اگر بجائے اسکے آپ یوں فرماتے کہ "اُس وقت اُس کا ایمان کامل نہیں ہوتا" تو اس میں کوئی زور اور وزن نہ ہوتا، اور ترہیب و تخویف جو حدیث کا مقصد ہے وہ بالکل فوت ہو جاتا، یا مثلاً چند صفحے پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اکثر خطبات میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ" (جس میں امانت نہیں، اُس میں ایمان نہیں، اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین میں

حصہ نہیں) اب اگر بجائے اسکے صریح الفاظ میں یہ فرمایا جاتا کہ "جس میں امانت نہیں وہ مؤمن کامل نہیں اور جو عہد کا پابند نہیں وہ پورا دیندار نہیں" تو ظاہر ہے کہ اس میں وہ زور اور اثر بالکل نہ ہوتا، جو حدیث کے موجودہ الفاظ میں ہے۔ بہر حال دعوت و موعظت اور انذار و ترہیب، جو ان حدیثوں کا اصل مقصد ہے اُس کیلئے یہی طرز بیان صحیح اور زیادہ موزوں و خوبصورت ہے۔

پس ان حدیثوں کو "[illegible]" اور فقہ کے "[illegible]" سمجھنا اور اس بنیاد پر ان گناہوں کے مُرتکبین کو ملّتِ اسلام سے خارج قرار دینا (جیسا کہ معتزلہ اور خوارج نے کیا ہے) ان حدیثوں کے اصل مقصد اور رسول اللہ ﷺ کے طرز کلام کی خصوصیات سے ناواقفی اور ناآشنائی کا نتیجہ ہے۔[1]

بعض منافقانہ اعمال و عادات

۵۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَّ مَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذِبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ چاروں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس کا حال یہ ہے کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، اور وہ اسی حال میں رہے گا، جب تک کہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے۔ وہ چاروں عادتیں یہ ہیں کہ جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے، تو اس میں خیانت کرے، اور جب باتیں کرے تو جھوٹ بولے، اور جب عہد معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب کسی سے جھگڑا اور اختلاف ہو تو بدزبانی کرے۔ [illegible]

تشریح ..... حقیقی اور اصلی نفاق، انسان کی جس بدترین حالت کا نام ہے، وہ تو یہ ہے کہ آدمی نے دل سے تو اسلام کو قبول کیا نہ ہو (بلکہ دل سے اس کا منکر اور مخالف ہو) لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے کو مؤمن و مُسلم ظاہر کرتا ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عبداللہ ابن ابی وغیرہ مشہور منافقین کا حال تھا، یہ نفاق دراصل بدترین اور ذلیل ترین قسم کا کفر ہے، اور ان ہی منافقین کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، کہ:

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

ضرور بالضرور یہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ڈالے جائیں گے۔

لیکن بعض بُری عادتیں اور بد خصلتیں بھی ایسی ہیں، جن کو ان منافقین سے خاص نسبت اور مناسبت ہے اور وہ دراصل اُن ہی کی عادتیں اور خصلتیں ہیں، اور کسی صاحب ایمان میں ان کی پرچھائیں بھی نہیں ہونی

---

[1] اس موقعہ پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا ایک افادہ قابل ذکر ہے، فرماتے ہیں کہ: "احادیث میں جن اعمال یا خصائل کو لازمۂ ایمان قرار دیا گیا ہے، اور اُن کے ترک و فقدان کی صورت میں "لا ایمان" یا "لا یؤمن" جیسے الفاظ فرمائے گئے ہیں اُن کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ واجب ہیں اور اُنکی جانبِ خلاف حرام"۔ [illegible]

چاہئے۔ پس اگر بد قسمتی سے کسی مسلمان میں ان میں سے کوئی عادت ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ اُس میں یہ منافقانہ عادت ہے، اور اگر کسی میں بد بختی سے منافقوں والی وہ ساری عادتیں جمع ہو جائیں، تو سمجھا جائے گا کہ وہ شخص اپنی سیرت میں پورا منافق ہے۔

الغرض ایک نفاق تو ایمان و عقیدے کا نفاق ہے، جو کفر کی بدترین قسم ہے، لیکن اسکے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا منافقوں والی سیرت ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے، مگر وہ عقیدے کا نہیں بلکہ سیرت اور کردار کا نفاق ہے اور ایک مسلمان کیلئے جسطرح یہ ضروری ہے کہ وہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ منافقانہ سیرت اور منافقانہ اعمال و اخلاق کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خصائل نفاق میں سے چار کا ذکر فرمایا ہے: ۱۔ خیانت، ۲۔ جھوٹ، ۳۔ عہد شکنی، ۴۔ بدزبانی اور ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو، اُس کو سمجھنا چاہئے کہ اُس میں ایک منافقانہ خصلت ہے اور جس میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہوں، وہ اپنی سیرت میں خالص منافق ہے۔

۵۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرا، کہ نہ تو اُس نے کبھی جہاد کیا اور نہ اپنے جی میں اُس کی تجویزیں سوچیں اور تمنا کی، تو وہ نفاق کی ایک صفت پر مرا۔ (مسلم)

تشریح..... یعنی ایسی زندگی جس میں دعوائے ایمان کے باوجود نہ کبھی راہ خدا میں جہاد کی نوبت آئے اور نہ دل میں اُس کا شوق اور اُس کی تمنا ہو، یہ منافقوں کی زندگی ہے، اور جو اسی حال میں اس دُنیا سے جائے گا وہ نفاق کی ایک صفت کے ساتھ جائے گا۔

۵۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ یَجْلِسُ یَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰی اِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَیْنَ قَرْنَیِ الشَّیْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَا یَذْكُرُ اللّٰهَ فِیْهَا اِلَّا قَلِیْلًا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ: یہ تو منافق والی نماز ہے کہ بے پروائی سے بیٹھا آفتاب کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ جب وہ زرد ہو گیا، اور اُسکے غروب کا وقت قریب آگیا تو نماز کو کھڑا ہوا، اور چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کے ختم کردی، اور اللہ کا ذکر بھی اُس میں بہت تھوڑا کیا۔ (مسلم)

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی شان تو یہ ہے کہ شوق کی بے چینی سے نماز کے وقت کا منتظر رہے، اور جب وقت آئے تو خوشی اور مستعدی سے نماز کیلئے کھڑا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت مجھے مالک الملک کے دربارِ عالی کی حضوری نصیب ہے، پورے اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرے، اور قیام و قعود اور رکوع و سجود میں خوب اللہ کو یاد کرے، اور اس سے اپنے دل کو شاد کرے، لیکن منافقوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز اُن کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے، وقت آجانے پر بھی اُس کو ٹالتے رہتے ہیں، مثلاً عصر کی نماز

کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب سورج بالکل ڈوبنے کے قریب ہو جاتا ہے، اور بس چڑیا کی سی چار چونچیں مار کے نماز پوری کر دیتے ہیں، اور اللہ کا نام بھی بس برائے نام ہی لیتے ہیں، پس یہ نماز منافق کی نماز ہے اور جو کوئی ایسی نماز پڑھتا ہے وہ مخلص مؤمنوں والی نہیں، بلکہ منافقوں والی نماز پڑھتا ہے۔

۵۵) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ عَنْه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ اَدْرَكَهُ الْاَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ خَرَجَ لَمْ يَخْرُجْ لِحَاجَةٍ وَهُوَ لَا يُرِيْدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں ہو، اور اذان ہو جائے اور وہ اس کے بعد بھی بلا کسی خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے اور نماز میں شرکت کے لئے واپسی کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو، تو وہ منافق ہے۔

تشریح: ..... مطلب یہ ہے کہ یہ منافقانہ طرز عمل ہے، پس ایسا کرنے والا اگر عقیدے کا منافق نہیں ہے تو وہ عملی منافق ہے۔

ایمان کے منافی نہیں اور ان پر مواخذہ نہیں

۵۶) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِيْ مَاوَسْوَسَتْ بِهٖ صَدْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ۔ (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل کے برے خیالات اور وسوسوں کو معاف کر دیا ہے، ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا، جب تک ان پر عمل نہ ہو اور زبان سے نہ کہا جائے۔

تشریح: انسان کے دل میں بعض اوقات بڑے گندے خیالات اور خطرات آتے ہیں، اور کبھی کبھی منکرانہ اور ملحدانہ سوالات و اعتراضات بھی دل و دماغ کو پریشان کرتے ہیں، اس حدیث میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ خیالات اور وساوس جب تک کہ صرف خیالات اور وساوس ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے، ہاں! جب یہی خیالات، خطرات و وساوس کی حد سے بڑھ کر اس شخص کا قول یا عمل بن جائیں، تو پھر ان پر مواخذہ اور محاسبہ ہوگا۔

۵۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّيْ اُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِالشَّيْءِ لَاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ، قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ اَمْرَهُ اِلَى الْوَسْوَسَةِ۔ (رواه ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: "کبھی کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کو زبان سے نکالوں؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی حمد اور اس کا شکر ہے جس نے اس کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔"

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ یہ غمگین اور فکر مند ہونے کی بات نہیں، بلکہ اس پر اللہ کا شکر کرو کہ اُسکے فضل وکرم اور اُس کی دستگیری نے تمہارے دل کو اُن برے خیالات کے قبول کرنے اور اپنانے سے بچالیا ہے، اور بات وسوسہ کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دی ہے۔

۵۸) **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسْأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِیْ اَنْفُسِنَا مَا یَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ یَتَکَلَّمَ بِهٖ؟ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْ تُمُوْهُ؟ قَالُوْا نَعَمْ، قَالَ ذَاكَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ۔** (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہیکہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے بُرے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ اُن کو زبان سے کہنا بھی بہت بُرا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں! یہی حال ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ تو خالص ایمان ہے۔ (مسلم)

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی یہ کیفیت کہ وہ دین و شریعت کے خلاف وساوس سے اتنا گھبرائے اور ان کو اتنا بُرا سمجھے کہ زبان سے ادا کرنا بھی اس کو گراں ہو، یہ خالص ایمانی کیفیت ہے۔

۵۹) **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یَاْتِی الشَّیْطَانُ اَحَدَکُمْ فَیَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ کَذَا؟ مَنْ خَلَقَ کَذَا؟ حَتّٰی یَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ رَبُّكَ فَاِذَا بَلَغَهٗ فَلْیَسْتَعِذْ بِاللهِ وَلِیَنْتَهِ۔** (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ (یہاں تک کہ یہی سوال وہ اللہ کے متعلق بھی دل میں ڈالتا ہے، کہ جب ہر چیز کا کوئی پیدا کرنے والا ہے تو پھر) اللہ کا پیدا کرنیوالا کون ہے؟ پس سوال کا سلسلہ جب یہانتک پہنچے تو چاہئے کہ بندہ اللہ سے پناہ مانگے، اور رُک جائے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے وسوسے اور سوالات شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں، اور جب شیطان کسی کے دل میں اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ جاہلانہ اور احمقانہ سوال ڈالے تو اُس کا سیدھا اور آسان علاج یہ ہے کہ بندہ شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے، اور خیال کو اُس طرف سے پھیر لے یعنی اس مسئلہ کو قابل توجہ اور لائق غور ہی نہ سمجھے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ جب اُس ہستی کا نام ہے جس کا وجود اُس کی ذاتی صفت ہے، اور جو تمام موجودات کو وجود بخشنے والا ہے، اُس کے متعلق یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

۶۰) **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَایَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَ لُوْنَ حَتّٰی یُقَالَ هٰذَاخَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ، فَمَنْ خَلَقَ اللهَ؟ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذَالِكَ شَیْئاً فَلْیَقُلْ اٰمَنْتُ بِاللهِ وَرُسُلِهٖ۔** (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چون وچرا کا سلسلہ جاری رہے گا، یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ نے سب مخلوق کو

پیدا کیا ہے، تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے، کہ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔ (رواہ مسلم)

تشریح ..... مطلب یہ ہے کہ مؤمن کا رویہ ان سوالات اور وساوس کے بارے میں یہ ہونا چاہئے کہ وہ سوال کرنے والے آدمی سے یا وسوسہ ڈالنے والے شیطان سے اور اپنے نفس سے صاف کہہ دے کہ اللہ اور اسکے رسولوں پر ایمان کی روشنی مجھے نصیب ہو چکی ہے، اسلئے میرے لئے یہ سوال بالکل قابل غور نہیں، جس طرح کسی آنکھوں والے کیلئے یہ سوال قابل غور نہیں کہ سورج میں روشنی ہے یا نہیں؟

ایمان و اسلام کا خلاصہ اور اس کا عطر

(۶۱) عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللهِ الثَّقَفِيْ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ قُلْ لِيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْأَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ (وَفِيْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ) قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ ـ (رواہ مسلم)

ترجمہ ..... سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اسلام کے بارے میں مجھے کوئی ایسی جامع اور شافی بات بتائیے کہ آپ کے بعد پھر میں کسی سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھوں" آپ نے ارشاد فرمایا: "کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر پوری طرح اور ٹھیک ٹھیک اس پر قائم رہو۔" (صحیح مسلم)

تشریح ..... مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کو اپنا اللہ اور رب مان کر اپنے کو بس اس کا بندہ بنادو، اور پھر اس ایمان اور عبدیت کے تقاضوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلنا اپنی زندگی کا دستور بنالو، بس یہی کافی ہے۔

یہ حدیث صحیح مسلم میں سے ہے، رسول اللہ ﷺ کے جواب کے ان دو لفظوں میں اسلام کا پورا خلاصہ آگیا ہے "ایمان باللہ اور اس پر استقامت" ہی اسلام کی غرض و غایت، بلکہ اس کی روح ہے۔ "ایمان باللہ" کا مطلب تو کتاب کے بالکل شروع میں حدیث جبرئیل کی تشریح میں بیان کیا جا چکا ہے، اور استقامت کے معنی ہیں بلا افراط و تفریط اور بغیر کسی کجی اور انحراف کے اللہ کی مقرر کی ہوئی "صراط مستقیم" پر قائم رہنا، اور ہمیشہ اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتے رہنا گویا تمام اوامر و نواہی اور جملہ احکام خداوندی کے صحیح تعمیل اور دائمی اتباع کا نام استقامت ہے، اور ظاہر ہے، کہ بندوں کے لئے اس سے آگے کوئی مقام نہیں، اسی لئے بعض اکابر صوفیہ نے فرمایا ہے:

اَلْاِسْتِقَامَةُ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ كَرَامَة یعنی استقامت ہزاروں کرامتوں سے بہتر اور بالاتر ہے۔

بہر حال استقامت وہ چیز ہے کہ اس کی تعلیم کے بعد کسی اور سبق کے لینے کی ضرورت نہیں رہتی، اور بس وہی انسان کے لئے کافی ہے، قرآن مجید میں بھی کئی جگہ انسان کی سعادت اور فلاح کو ایمان باللہ اور استقامت ہی سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ـ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءً ۢبِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ـ (الاحقاف ۴۶: ۱۳، ۱۴)

بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہی ہے (اور ہم اسی کے بندے ہیں) اور پھر وہ اس پر مستقیم رہے، تو انہیں کوئی خوف و خطر نہیں، اور نہ ان کو رنج و غم ہوگا وہ سب جنتی ہیں، اپنے اعمال کے بدلہ میں وہ جنت ہی میں ہمیشہ رہینگے۔

بلکہ "ارجاع السنۃ الی الکتاب" کے اصول پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفیان بن عبداللہ ثقفی کو یہ جواب شاید ایسی ہی آیات کی روشنی میں دیا ہوگا۔[1]

۶۲) عَنْ تَمِيمِ الدَّارِيْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ۔ حضرت تمیم داری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین نام ہے خلوص و وفاداری کا۔ ہم نے عرض کیا کہ "کس کے ساتھ خلوص[2] اور وفاداری؟" ارشاد فرمایا اللہ کے ساتھ، اللہ کی کتاب کے ساتھ، اللہ کے رسول کیساتھ، مسلمانوں کے سرداروں پیشواؤں کے ساتھ اور اُنکے عوام کے ساتھ۔ (مسلم)

تشریح۔۔۔۔ یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" میں سے ہے، امام نووی نے لکھا ہے کہ کل مقاصد دین کو یہ حدیث جامع ہے، اور اس پر عمل کر لینا گویا دین کے پورے منشا کو ادا کر دینا ہے، کیونکہ دین کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس حدیث کے مضمون سے باہر رہ گیا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، کہ اس حدیث میں اللہ، کتاب اللہ، رسول اللہ، ائمہ اُمت و پیشوایان ملت، اور عوام مسلمانوں کے ساتھ خلوص و وفاداری کو دین بتلایا گیا ہے، اور یہی کُل دین ہے، کیونکہ اللہ کیساتھ اخلاص و وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے ممکن حد تک اُسکی معرفت حاصل کی جائے، اُس کے ساتھ انتہائی محبت کی جائے، اُس کی اطاعت و عبدت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، اور مالک و مقتدر جانتے ہوئے اُس سے ڈرا جائے، غرض پورے اخلاص و وفا کے ساتھ عبدیت کا حق ادا کیا جائے۔

اور کتاب اللہ کے ساتھ وفاداری یہ ہے کہ اُس پر ایمان لایا جائے، اُس کا حق عظمت ادا کیا جائے، اُس کا علم حاصل کیا جائے، اُس کا علم پھیلایا جائے، اس پر عمل کیا جائے۔

علی ھذا رسول اللہ ﷺ کیساتھ خلوص و وفا یہ ہے کہ آپکی تصدیق کیجائے تعظیم و توقیر کیجئے، اُن سے اُنکی تعلیمات اور اُنکی سنتوں سے محبت کی جائے، اور دل و جان سے اُن کی پیروی و غلامی میں اپنی نجات سمجھی جائے۔

اور ائمہ مسلمین (یعنی مسلمانوں کے سرداروں اور پیشواؤں، حاکموں اور رہنماؤں) کے ساتھ خلوص و وفاداری یہ ہے کہ اُن کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اُن کی مدد کی جائے، اُن کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، اور اگر اُن سے کوئی غفلت اور غلطی ہوتی نظر آئے تو بہتر طریقہ پر اُس کی اصلاح اور درستگی کی کوشش کی جائے، اچھے مشوروں سے دریغ نہ کیا جائے، اور معروف کی حد تک اُن کی بات مانی جائے۔

اور عام مسلمانوں کے ساتھ خلوص و وفا یہ ہے کہ اُن کی ہمدردی و خیر خواہی کا پورا پورا خیال رکھا جائے،

---

[1] بعض ائمہ اور علماء محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات عموماً قرآن مجید سے ماخوذ اور مستنبط ہوتے تھے، اور آپ کے ہر ارشاد کا مرجع و ماخذ قرآن پاک میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ائمہ سلف میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ اور حضرت امام شافعیؒ سے بھی یہ رائے نقل کی گئی ہے، اور ہمارے علماء متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ نے "خیر کثیر" میں یہی رائے ظاہر فرمائی ہے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ میں اسطرح پر غور کیا تو "کتاب الصلوٰۃ" کی تمام احادیث کا مرجع اور ماخذ قرآن پاک میں مجھے مل گیا۔ کاش شاہ صاحبؒ اس کام کو کر جاتے۔

[2] اس حدیث میں "نصیحت" کا لفظ جس مفہوم کا حامل ہے اس کو ترجمہ میں اس ناچیز نے "خلوص و وفاداری" سے ادا کیا ہے، اُردو اس مفہوم کی ادائیگی کیلئے اس سے بہتر شاید کوئی لفظ نہ مل سکے۔ "نصیحت" "نصح" بمعنی خلوص سے مشتق ہے، یقال نصح الشی اذا خلص و نصحت العسل اذا صفیتہ ۱۲م

اُن کا نفع اپنا نفع اور اُن کا نقصان اپنا نقصان سمجھا جائے، جائز اور ممکن خدمت اور مدد سے دریغ نہ کیا جائے۔ الغرض علیٰ فرقِ مراتب اُنکے جو حقوق عظمت و شفقت اور خدمت و تعاون کے مقرر ہیں اُن کو ادا کیا جائے۔

اس تفصیل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ یہ حدیث کس طرح پورے دین کو حاوی ہے اور دین کے تمام شعبوں کو ان مختصر لفظوں میں کس طرح ادا کر دیا گیا ہے۔ اور اس پر صحیح طور سے عمل کرنا گویا پورے دین پر عمل کرنا ہے۔

تقدیر کا ماننا جزوِ ایمان ہے

(حدیث جبرئیل کے ضمن میں اور بعض اور حدیثوں میں بھی تقدیر کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اور اجمالاً معلوم ہو چکا ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا بھی ضروریات میں سے ہے، لیکن یہاں تقدیر کے متعلق چند حدیثیں مستقل طور سے ذکر کی جائیں گی، جن سے اس اہم مسئلہ کی اہمیت اور کچھ تفصیلات بھی معلوم ہونگی۔)

عَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اَتَيْتُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْئٌ مِنَ الْقَدْرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللهَ اَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ. فَقَالَ لَوْ اَنَّ اللهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوَاتِهٖ وَاَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ . وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ مَا قَبِلَهُ اللهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَلَوْمِتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ. قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَاللهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَ ذَالِكَ۔ (رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ)

ابن الدیلمی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں (مشہور صحابی رسول) ابی بن کعب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ خلجان سا پیدا ہو گیا ہے، لہٰذا آپ اسکے متعلق کچھ بیان فرمائیں، شاید اللہ تعالیٰ اس خلجان کو میرے دل سے دور کر دے (اور مجھے اس مسئلہ میں اطمینان نصیب ہو جائے)۔ انہوں نے فرمایا: سنو! اگر اللہ تعالیٰ اپنے زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو عذاب میں ڈال دے، تو وہ اپنے اس فعل میں ظالم نہ ہوگا اور اگر وہ ان سب کو اپنی رحمت سے نوازے، تو اسکی یہ رحمت اُنکے اعمال سے بہتر ہو گی، (یعنی ان پر یہ اسکا محض فضل و احسان ہو گا، اُن کے اعمال کا واجب حق نہ ہو گا اور سنو! تقدیر پر ایمان لانا اس قدر ضروری ہے، کہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کر دو، تو اللہ کے یہاں وہ قبول نہ ہو گا جب تک کہ تم تقدیر پر ایمان نہ لاؤ، اور تمہارا پختہ اعتقاد یہ نہ ہو کہ جو کچھ تمہیں پیش آتا ہے، تم کسی طرح اُس سے چھوٹ نہیں سکتے تھے، اور جو حالات تم پر پیش نہیں آتے وہ تم پر آ ہی نہیں سکتے تھے (یعنی جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر اور مقرر ہو چکا ہے اور اس مقررہ پروگرام میں ذرہ برابر تبدیلی بھی ممکن نہیں ہے) اور اگر تم اسکے خلاف اعتقاد رکھتے ہوئے مر گئے، تو یقیناً تم دوزخ میں جاؤ گے۔ ابن الدیلمی کہتے ہیں، کہ ابی بن کعب سے یہ سننے کے بعد میں عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے بھی مجھ سے یہی فرمایا، اسکے بعد میں حذیفہ کی خدمت

میں حاضر ہوا، تو انھوں نے بھی مجھ سے یہی فرمایا، پھر میں زید بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے یہی بات رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے طور پر مجھ سے بیان فرمائی۔ [illegible]

تشریح..... تقدیر کے متعلق ایک عام وسوسہ جس کو شیطان کبھی کبھی بعض ایمان والوں کے قلوب میں بھی ڈالتا ہے، یہی ہے کہ جب سب کچھ اللہ ہی کی تقدیر سے ہورہا ہے تو پھر دنیا میں کوئی اچھے حال میں اور کوئی بُرے حال میں کیوں ہے، اور آخرت میں کیوں کسی کو جنت میں اور کسی کو دوزخ میں ڈالا جائے گا!..... اگر کسی صاحب ایمان کے دل میں کبھی یہ وسوسہ آئے، تو اسکے دفع کرنے کی آسان اور مختصر تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے تمام بندوں اور ساری مخلوقات پر جو کامل اختیار حاصل ہے اُس کی یاد تازہ کرلی جائے، اور سوچا جائے کہ ایسا لاشریک مالک الملک اور عدم محض سے وجود میں لانے والا خالق وصانع اپنی جس مخلوق کے ساتھ جو معاملہ بھی کرے، بلاشبہ وہ اُس کا حقدار ہے، وہ سب کو عذاب میں مبتلا کرے، تو کسی قانون سے اُسکو ظالم نہیں کہا جاسکتا اور اگر سب کو رحمت سے نوازے، تو یہ رحمت اُسکی محض بخشش ہی ہوگی، کیونکہ جو نیکوکار لوگ نیک اعمال کرتے ہیں انکی توفیق دینے والا، اور اعمال کرانے والا بھی وہی ہے۔ بہر حال مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اس خاص حیثیت کو اگر اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے، تو مؤمن کے دل سے تو یہ شبہ بالکل جاتا رہے گا، اور اُس کو اطمینان ہو جائے گا۔

ابن الدیلمی بحمداللہ چونکہ سچے مؤمن تھے، اور اللہ تعالیٰ کی اس شان پر ایمان واعتقاد رکھتے تھے، اسلئے ان صحابہ کرامؓ نے اسی کی یاد دہانی کے ذریعہ ان کے وسوسہ کا علاج کیا اور انہیں یہ بھی بتلادیا کہ تقدیر پر ایمان و اعتقاد اتنا ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص اس عقیدے کے بغیر پہاڑ کے برابر سونا بھی راہِ خدا میں خرچ کرے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہوگا۔

بہر حال یہ ملحوظ رہنا چاہئے، کہ اس طریقہ سے صرف اہلِ ایمان ہی کے اس قسم کے وسوسے کا علاج کیا جاسکتا ہے دوسرے لوگوں کی طرف سے تقدیر کے متعلق جو شبہات کئے جاتے ہیں ان کے جواب کا طریقہ دوسرا ہے، اسکے معلوم کرنے کے لئے علم کلام کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور کچھ مختصر اشارات انشاءاللہ آئندہ صفحات میں کئے جائیں گے۔

٦٤) عَنْ اَبِیْ خِزَامَةَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللهِ اَرَأَیْتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِیْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدْرِ اللهِ شَیْئًا؟ قَالَ هِیَ مِنْ قَدْرِ اللهِ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ ابو خزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: کیا ارشاد ہے اس بارہ میں کہ جھاڑ پھونک کے وہ طریقے جن کو ہم دکھ درد میں استعمال کرتے ہیں، یا دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں، یا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کی وہ تدبیریں جن کو ہم اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرتے ہیں، کیا یہ چیزیں اللہ کی قضاء وقدر کو لوٹا دیتی ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ سب چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں۔ [illegible]

تشریح ... رسول اللہ ﷺ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں جن اسباب کا استعمال کرتے ہیں، وہ سب بھی اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی یہ مقدر اور مقرر ہوتا ہے کہ فلاں شخص پر فلاں بیماری آئے گی، اور فلاں قسم کے جھاڑ پھونک، یا فلاں دوا کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا ..... اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس نہایت مختصر دو لفظی جواب سے مسئلہ تقدیر کے متعلق بہت سے شبہات اور سوالات کا جواب ہو جاتا ہے۔

۶۵) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَامِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟ قَالَ اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ، "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى ○ وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ○ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○

(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جا چکا ہے (مطلب یہ ہے کہ جو شخص دوزخ میں یا جنت میں جہاں بھی جائے گا، اس کی وہ جگہ پہلے سے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے)" صحابہ نے عرض کیا: تو کیا ہم اپنے اس نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں، اور سعی و عمل چھوڑ نہ دیں (مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ پہلے ہی سے طے شدہ اور لکھا ہوا ہے، تو پھر ہم سعی و عمل کی دردسری کیوں مول لیں)۔ آپ نے فرمایا: "نہیں! عمل کئے جاؤ، کیونکہ ہر ایک کو اسی کی توفیق ملتی ہے جس کیلئے وہ پیدا ہوا ہے، پس جو کوئی نیک بختوں میں سے ہے تو اس کو سعادت اور نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے، اور جو کوئی بد بختوں میں سے ہے اس کو شقاوت اور بد بختی والے اعمال بد ہی کی توفیق ملتی ہے، اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ○ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○ (واللیل)

جس نے راہِ خدا میں دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی (یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کیا) تو اس کو ہم چین وراحت کی زندگی، یعنی جنت حاصل کرنے کی توفیق دینگے، اور جس نے بخل سے کام لیا، اور مغرور و بے پرواہ رہا، اور اچھی بات کو یعنی دعوتِ ایمان کو جھٹلایا، تو اسکے واسطے ہم تکلیف کی اور دشواری والی زندگی (یعنی دوزخ) کی طرف چلنا آسان کر دیں گے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح..... رسول اللہ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ ہر شخص کے لئے اس کا آخری ٹھکانہ دوزخ یا جنت میں پہلے سے مقرر ہو چکا ہے، لیکن اچھے یا برے اعمال سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی پہلے سے مقدر

ہے، اور تقدیر الٰہی میں یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ جو جنت میں جائے گا، وہ اپنے فلاں فلاں اعمالِ خیر کے راستے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا وہ اپنی فلاں فلاں بد اعمالیوں کی وجہ سے جائے گا، پس جنتیوں کے لئے اعمالِ خیر اور دوزخیوں کے لئے اعمالِ بد بھی مقدور و مقرر ہیں، اور اسلئے ناگزیر ہیں، حضور ﷺ کے اس جواب کا ماحصل بھی قریب قریب وہی ہے، جو اوپر والی حدیث میں آپ کے جواب کا تھا۔ ابھی عنقریب اس مضمون کی کچھ اور وضاحت اور تفصیل بھی کی جائے گی۔

(۶۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كُلُّ شَيْئٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزَ وَالْكَيْسَ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر چیز تقدیر سے ہے، یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ اور ناقابل ہونا، اور قابل و ہوشیار ہونا بھی تقدیر ہی سے ہے۔" (صحیح مسلم)

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ آدمی کی صفات قابلیت و ناقابلیت، صلاحیت و عدم صلاحیت، اور عقلمندی و بیوقوفی وغیرہ بھی اللہ کی تقدیر ہی سے ہیں، الغرض اس دنیا میں جو کوئی جیسا، اور جس حالت میں ہے وہ اللہ کی قضاء و قدر کے ماتحت ہے۔

(۶۷) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدْرِ فَغَضِبَ حَتَّى احْمَرَّ وَجْهُهٗ حَتّٰى كَاَنَّمَا فُقِئَ فِيْ وَجْنَتَيْهِ حَبُّ الرُّمَّانِ فَقَالَ اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَيْكُمْ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ، عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ اَنْ لَاتَنَازَعُوْا فِيْهِ ۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ (مسجد نبوی میں بیٹھے) قضا و قدر کے مسئلہ میں بحث مباحثہ کر رہے تھے، کہ اسی حال میں رسول اللہ ﷺ باہر سے تشریف لے آئے (اور ہم کو یہ بحث کرتے دیکھا) تو آپ بہت برافروختہ اور غضبناک ہوئے، یہاں تک کہ چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا، اور اس قدر سُرخ ہوا، کہ معلوم ہوتا تھا آپ کے رخساروں پر انار نچوڑ دیا گیا ہے۔ پھر آپ نے ہم سے فرمایا: کیا تم کو یہی حکم کیا گیا ہے، کیا میں تمہارے لئے یہی پیام لایا ہوں (کہ تم قضاء و قدر کے جیسے اہم اور نازک مسئلوں میں بحث کرو)۔ خبردار! تم سے پہلی امتیں اُسی وقت ہلاک ہوئیں جبکہ اُنہوں نے اس مسئلہ میں حجت و بحث کو اپنا طریقہ بنالیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں، میں تم پر لازم کرتا ہوں، کہ اس مسئلہ میں ہرگز حجت اور بحث نہ کیا کرو۔ (ترمذی)

تشریح..... قضاء و قدر کا مسئلہ بلاشبہ مشکل و نازک مسئلہ ہے، لہذا مؤمن کو چاہئے کہ اگر یہ مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آئے، تو بحث اور حجت نہ کرے، بلکہ اپنے دل و دماغ کو اس پر مطمئن کر لے کہ اللہ کے صادق و مصدوق رسول نے اس مسئلہ کو اسی طرح بیان فرمایا ہے، لہذا ہم اس پر ایمان لائے۔ تقدیر کا مسئلہ تو اللہ تعالیٰ کی صفات سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس کو نازک اور مشکل ہونا ہی چاہئے، ہمارا حال تو یہ ہے کہ اسی دنیا کے بہت سے معاملات اور بہت سے رازوں کو ہم میں سے بہت سے نہیں سمجھ سکتے، پس جب اللہ کے سچے

پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ایک حقیقت بیان فرمادی (جس کا پوری طرح سمجھ لینا سب کے لئے آسان نہیں ہے) تو جن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے، ان کے لئے بھی ایمان لانے کے بعد صحیح طریق کار یہی ہے کہ وہ اسکے بارے میں کوئی بحث اور کٹ حجتی نہ کریں، بلکہ اپنے قول اور اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس پر ایمان لائیں۔

رسول اللہ ﷺ کے سخت غصہ اور جلال کی وجہ غالباً یہ تھی، کہ حضرات آپ کی تعلیم و تربیت میں تھے، اور آپ سے براہِ راست دین حاصل کر رہے تھے، ان کو جب آپ نے اس غلطی میں مبتلا دیکھا، تو قلبی تعلق رکھنے والے معلم و مربی کی طرح آپ کو سخت غصہ آیا۔

اس موقع پر آپ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ "تم سے پہلی امتیں اسی وقت ہلاک ہوئیں جبکہ انہوں نے اس مسئلہ میں حجت و بحث کا طریقہ اختیار کیا"۔ تو یہاں امتوں کے ہلاک ہونے سے مراد غالباً گمراہی ہے۔ قرآن و حدیث میں ہلاکت کا لفظ گمراہی کیلئے بکثرت استعمال ہوا ہے، اس بنا پر آپکے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگلی امتوں میں اعتقادی گمراہیاں اس وقت آئیں، جبکہ انہوں نے اس مسئلہ کو حجت و بحث کا موضوع بنایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ امت محمدیہ میں بھی اعتقادی گمراہیوں کا سلسلہ اسی مسئلہ سے شروع ہوا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اس حدیث میں ممانعت حجت اور نزاع سے فرمائی گئی ہے، پس اگر کوئی شخص تقدیر کے مسئلہ پر ایک مؤمن کی طرح قطعی ایمان رکھتے ہوئے صرف اطمینان قلبی کے لئے اس مسئلہ کے بارے میں کسی اہل سے سوال کرے، تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

اس سے پہلی دو حدیثوں میں خود رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب ہی میں اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کو خود سمجھایا ہے۔

۶۸) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كَتَبَ اللهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفِ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ۔
(رواہ مسلم)

ترجمہ: عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں، اور فرمایا کہ اسکا عرش پانی پر تھا"۔ (مسلم)

تشریح...... اس حدیث میں چند چیزیں غور طلب ہیں: اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تقدیر لکھنے سے کیا مراد ہے؟۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو ہے نہیں، کہ جس طرح ہم انسان ہاتھ میں قلم لے کے کاغذ یا تختی پر کچھ لکھتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھا ہو، ایسا خیال کرنا اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس سے ناواقفی ہے، دراصل اللہ تعالیٰ کے افعال و صفات کی حقیقت اور کیفیت کے ادراک سے ہم قاصر ہیں، اور چونکہ اس کے لئے الگ کوئی زبان اور لغت نہیں ہے، اسلئے ہم مجبوراً انہیں الفاظ سے اسکے افعال و صفات کی تعبیر کرتے ہیں جو دراصل ہمارے افعال و صفات کیلئے وضع کئے گئے ہیں، ورنہ اُسکے اور ہمارے افعال و صفات کی حقیقت اور کیفیت میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا کہ اس کی عالی ذات اور ہماری ذاتوں میں ہے۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس حدیث میں جس کتابت تقدیر کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے، علاوہ ازیں یہ بھی واقعہ ہے کہ عربی زبان میں کسی چیز کے طے کر دینے اور معین و مقرر کر دینے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اسی معنی کے اعتبار سے روزہ کی فرضیت کو "کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" سے اور قصاص کے حکم کو "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ" سے تعبیر کیا گیا ہے، پس اگر حدیث مذکور میں بھی کتابت سے یہی مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں معین کیں، اور جو کچھ ہونا ہے اس کو مقرر فرمایا[1]۔ اس معنی کا ایک قرینہ یہ بھی ہے، کہ بعض روایات میں بجائے "کتب" کے "قدر" کا لفظ بھی آیا ہے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے، کہ کتابت تقدیر کے سلسلے کی بعض غیر معتبر روایتوں میں قلم اور لوح وغیرہ سے متعلق جو تفصیلات نقل کی گئی ہیں، وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔[2]

دوسری بات اس حدیث سے متعلق یہ بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ پچاس ہزار برس سے مراد بہت طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے، عربی زبان اور عربی محاورے میں یہ استعمال شائع ذائع ہے۔

حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے، کہ: "اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ، عرش اور پانی اُس وقت پیدا کئے جا چکے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ: جس طرح ہماری قوتِ خیالیہ میں ہزاروں چیزوں کی صورتیں، اور ان کے متعلق معلومات جمع رہتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے کسی خاص قوت میں (جس کو ہماری قوتِ خیالیہ کے مشابہ سمجھنا چاہئے) تمام مخلوقات اور ان کے تمام احوال اور حرکات و سکنات کو، غرض جو کچھ عالم وجود میں آنے والا ہے اس سب کو عرش کی اس قوت میں ثبت فرما دیا، گویا دنیا کے پردے پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب عرش کی اس قوت میں اسی طرح موجود و محفوظ ہے جس طرح ہمارے خیال میں لاکھوں صورتیں اور ان کے متعلق معلومات ہوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے سے یہی مراد ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

٦٩) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَالِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَالِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ اِلَيْهِ مَلَكًا بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهٗ وَاَجَلَهٗ وَرِزْقَهٗ وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيْدٌ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحَ فَوَالَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا تَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (رواه البخاری و مسلم)

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱۶۶، ج ۱)۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ۔ ۱۲

ترجمہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے صادق و مصدوق پیغمبر ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا: ”تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ کی شکل میں جمع رہتا ہے (یعنی پہلے چلہ میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوتا، صرف خون میں کچھ غلظت آجاتی ہے، اسی کو "نطفہ" کہا گیا ہے[1]) پھر اسکے بعد اتنی ہی مدت منجمد خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے (اور اسی مدت میں اعضاء کی تشکیل اور ہڈیوں کی بناوٹ بھی شروع ہوجاتی ہے) پھر اللہ تعالیٰ (مندرجۂ ذیل) چار باتیں لے کر ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے، یہ فرشتہ اسکے اعمال اسکی مدت عمر اور وقت موت، اور اس کا رزق لکھتا ہے، اور یہ کہ بدبخت ہے یا نیک بخت، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔ پس قسم اُس ذات کی جس کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتۂ تقدیر آگے آجاتا ہے، اور وہ دوزخیوں کے عمل کرنے لگتا ہے، اور انجام کار دوزخ میں چلا جاتا ہے اور (اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) تم میں سے کوئی دوزخیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اسکے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتۂ تقدیر آگے آجاتا ہے اور وہ جنتیوں کے عمل کرنے لگتا ہے، اور جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح...... اس حدیث میں دو مضمون بیان فرمائے گئے ہیں، شروع میں تو تخلیق انسانی کے ان چند مرحلوں کا ذکر ہے جس سے انسان نفخ روح تک رحم مادر میں گزرتا ہے، (اور غالباً ان مرحلوں کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا فرشتہ نفخ روح کے وقت پر پیدا ہونے والے انسان کے متعلق لکھتا ہے، جس میں اسکے اعمال، اس کی مدتِ حیات اور وقت موت، اور روزی اور نیک بختی یا بدبختی کی تفصیل ہوتی ہے، حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضور ﷺ کا خاص منشاء اسی نوشتہ کے متعلق یہ بیان فرمانا ہے، کہ یہ ایسا قطعی اور اٹل ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اس نوشتہ میں دوزخیوں میں لکھا ہوتا ہے، بسا اوقات وہ ایک مدت تک جنتیوں کی سی پاکبازانہ زندگی گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت سے بہت ہی قریب ہوتا جاتا ہے لیکن پھر ایک دم اُسکے رویہ میں تبدیلی ہوتی ہے، اور وہ دوزخ میں لے جانے والے بُرے اعمال کرنے لگتا ہے، اور اسی حال میں مر کر بالآخر دوزخ میں چلا جاتا ہے، اور اسکے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جو فرشتہ کے نوشتہ میں اہل جنت میں لکھا ہوتا ہے، وہ ایک عرصہ تک دوزخیوں کی سی زندگی گزارتا رہتا ہے، اور دوزخ کے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اسکے اور دوزخ کے درمیان گویا ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا لیکن پھر ایک دم وہ سنبھل جاتا ہے، اور اہلِ جنت کے اعمال صالحہ کرنے لگتا ہے، اور اسی حال میں مر کر جنت میں چلا جاتا ہے۔

اس حدیث کا خاص سبق یہ ہے کہ کسی کو بداعمالیوں میں مبتلا دیکھ کر اسکے قطعی دوزخی ہونے کا حکم نہ لگانا چاہئے، کیا معلوم زندگی کے باقی حصے میں اس کا رخ اور رویہ کیا ہونے والا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آج اعمالِ خیر کی توفیق کسی کو مل رہی ہے تو اس پر اسکو مطمئن نہ ہوجانا چاہئے، بلکہ برابر حسن

---

[1] و يسمى مالم يتغير من صورة الدم تغير افاحشاً نطفة۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ۱۶۸، ج۱)

خاتمہ کے لئے فکر مند رہنا چاہئے۔

۷۰) **عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَّاحِدٍ يُصَرِّفُهٗ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ.** (رواه مسلم)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بنی آدم کے تمام قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، ایک دل کی طرح، وہ جس طرح (اور جس طرف) چاہتا ہے اس کو پھیر دیتا ہے"۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے دلوں کے پھیرنے والے، ہمارے دل اپنی اطاعت و بندگی کی طرف پھیر دے"۔

تشریح ...... ابھی اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال و صفات کو سمجھنے سمجھانے کے لئے چونکہ الگ کوئی زبان نہیں ہے، اسلئے مجبوراً اسکے لئے بھی ان ہی الفاظ و محاورات کا استعمال کیا جاتا ہے، جو دراصل انسانی افعال و صفات کیلئے وضع کئے گئے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں جو کہا گیا ہے، کہ بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اسکے قبضہ تصرف میں ہیں، وہی جدھر چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ اور حدیث کی یہ تعبیر بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہمارے محاورے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو بالکل میری مٹھی میں ہے۔ مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ بالکل میرے اختیار میں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے دلوں کو بھی اللہ ہی جدھر چاہتا ہے پھیرتا ہے۔

مندرجۂ بالا حدیثوں سے تقدیر کے متعلق چند باتیں معلوم ہوئیں:

۱) اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں مقدر فرمادیں، اور جو کچھ ہونا ہے گویا وہ سب بالتفصیل لکھ دیا۔

۲) انسان جب رحم مادر میں ہوتا ہے اور اس پر تین چلے گزر جاتے ہیں، اور نفخ روح کا وقت آتا ہے تو اللہ کا مقرر کیا ہوا فرشتہ اسکے متعلق چار باتیں لکھتا ہے۔ اسکی مدتِ عمر، اسکے اعمال، اسکا رزق اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا۔

۳) ہمارے دلوں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

دراصل تقدیر الٰہی کے یہ مختلف درجے اور مختلف مظاہر ہیں، اور حقیقی ازلی تقدیر ان سب سے سابق ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تقدیر الٰہی کے ان مختلف مدارج اور مظاہر کو بہت سلجھا کر بیان فرمایا ہے، ذیل میں ہم ان کے کلام کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

تقدیر کے مختلف مدارج

۱) ازل میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہ تھا، زمین و آسمان، ہوا پانی، عرش و کرسی میں سے کوئی چیز بھی پیدا نہ کی گئی تھی (كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ) تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیدا ہونے والی

اس ساری کائنات کا پورا پورا علم تھا۔ پس اس دور ازل ہی میں اس نے ارادہ اور فیصلہ کیا، کہ اس تفصیل اور ترتیب کے مطابق جو میرے علم میں ہے، میں عالم کو پیدا کرونگا اور اس میں یہ یہ واقعات پیش آئیں گے۔ الغرض آئندہ وجود میں آنیوالے عالم کے متعلق جو تفصیل و ترتیب اسکے ازلی علم میں تھی، اسے ازل ہی میں طے فرمایا، کہ میں اس سب کو وجود میں لاؤنگا۔ پس یہ طے فرمانا ہی تقدیر کا پہلا مرتبہ اور پہلا ظہور ہے۔

۲) پھر ایک وقت آیا، جبکہ پانی اور عرش پیدا کئے جا چکے تھے، مگر زمین و آسمان پیدا نہ ہوئے تھے۔ (بلکہ حدیث نمبر ۶۸ کی تصریح کے مطابق زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں پہلی ازلی تقدیر کے مطابق لکھدیں، (جس کی حقیقت حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ عرش کی قوت خیالیہ میں تمام مخلوق کی تفصیلی تقدیر منعکس کر دی اور اس طرح عرش اس تقدیر کا حامل ہو گیا) یہ تقدیر کا دوسرا درجہ اور دوسرا ظہور ہوا۔

۳) پھر ہر انسان کی تخلیق جب رحم مادر میں شروع ہوتی ہے، اور تین چلے گزر جانے پر جب اس میں روح ڈالنے کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا فرشتہ اللہ تعالیٰ ہی سے علم حاصل کر کے اسکے متعلق ایک تقدیری نوشتہ مرتب کرتا ہے، جس میں اس کی مدت حیات، اعمال، رزق اور شقاوت یا سعادت کی تفصیل ہوتی ہے، یہ نوشتہ تقدیر کا تیسرا درجہ اور تیسرا ظہور ہے۔

۴) پھر انسان جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وہ اس کو کرتا ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۷۰ میں فرمایا، کہ انسانوں کے سب دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے، پس یہ تقدیر کا چوتھا درجہ اور چوتھا ظہور ہے۔

اگر اس تفصیل کو ملحوظ رکھا جائے تو تقدیر کے سلسلہ کی مختلف احادیث کے مطالب و محامل کے سمجھنے میں انشاءاللہ مشکل پیش نہ آئے گی۔

مسئلہ تقدیر سے متعلق بعض شبہات کا ازالہ

بہت سے لوگوں کو کم فہمی یا نافہمی سے تقدیر کے متعلق جو شبہات ہوتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ان کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ اس مسئلہ میں مندرجہ ذیل تین اشکال مشہور ہیں۔

اول...... یہ کہ دنیا میں اچھا برا جو کچھ ہوتا ہے، اگر یہ سب اللہ ہی کی تقدیر سے ہے، اور اللہ ہی نے اس کو مقدر کیا ہے تو پھر اچھائیوں کے ساتھ تمام برائیوں کی ذمہ داری بھی (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ پر آئے گی۔

دوسرا...... یہ کہ جب سب کچھ پہلے سے من جانب اللہ مقدور ہو چکا ہے، اور اس کی تقدیر اٹل ہے، تو بندے اسی کے مطابق کرنے پر مجبور ہیں، لہٰذا انہیں کوئی جزا سزا نہ ملنی چاہئے۔

تیسرا...... شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے جب وہ سب پہلے سے مقدر ہی ہو چکا ہے اور اسکے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا ہے، تو پھر کسی مقصد کے لئے کچھ کرنے دھرنے کی ضرورت ہی نہیں لہٰذا دنیا یا آخرت کے کسی کام کے لئے محنت اور کوشش فضول ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ یہ تینوں شبہے تقدیر کے غلط اور ناقص تصور سے پیدا ہوتے ہیں۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ اللہ کی تقدیر اسکے علم ازلی کے مطابق، اور اس کارخانۂ عالم میں جو کچھ جس طرح اور جس صفت کے ساتھ اور جس سلسلہ سے ہو رہا ہے وہ بالکل اسی طرح، اور اسی صفت اور اسی سلسلہ کیساتھ اسکے علم ازلی میں تھا، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مقدر فرمادیا ہے۔

اور ہم میں سے جو شخص بھی اپنے اعمال وافعال پر غور کرے گا، وہ بغیر کسی شک شبہ کے اس حقیقت کو محسوس کریگا کہ اس دنیا میں ہم جو بھی اچھے یا بُرے عمل کرتے ہیں، وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں، ہر کام کے کرنے کے وقت اگر ہم غور کریں تو بدیہی اور یقینی طور پر محسوس ہوگا کہ ہم کو یہ قدرت حاصل ہے کہ چاہیں تو اسکو کریں اور چاہیں تو نہ کریں، پھر اس قدرت کے باوجود ہم اپنے خداداد ارادے اور اختیار سے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اسی فیصلے کے مطابق عمل ہوتا ہے پس اس عالم میں جس طرح ہم اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنے تمام کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو ازل میں اسی طرح انکا علم تھا اور پھر اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انکو مقدر فرمایا اور اس پورے سلسلے کے وجود کا فیصلہ فرمادیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے صرف ہمارے اعمال ہی کو مقدر نہیں فرمایا ہے، بلکہ جس ارادہ اور اختیار سے ہم عمل کرتے ہیں وہ بھی تقدیر میں آچکا ہے، گویا تقدیر میں صرف یہی نہیں ہے، کہ فلاں شخص فلاں اچھا یا بُرا کام کریگا، بلکہ تقدیر میں یہ پوری بات ہے، کہ فلاں شخص اپنے ارادہ واختیار سے ایسا کریگا، پھر اس سے یہ نتائج پیدا ہوں گے، پھر اُسکو یہ جزا یا سزا ملے گی۔

الغرض ہم کو اعمال میں جو ایک گونہ خود اختیاری اور خود ارادیت حاصل ہے، جسکی بناء پر ہم کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں، وہ بھی تقدیر میں ہے، اور ہمارے اعمال کی ذمہ داری اُسی پر ہے، اور اُسی کی بناء پر انسان مکلّف ہے، اور اسی پر جزاء وسزا کی بنیاد ہے۔

بہر حال تقدیر نے اس خود اختیاری اور خود ارادیت کو باطل اور ختم نہیں کیا، بلکہ اسکو اور زیادہ ثابت اور مستحکم کر دیا ہے، لہٰذا تقدیر کی وجہ سے نہ تو ہم مجبور ہیں، اور نہ ہمارے اعمال کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔

ایسے ہی جن مقاصد کے لئے ہم جو کوششیں اور جو تدبیریں اس دُنیا میں کرتے ہیں، تقدیر میں بھی ہمارے ان مقاصد کو ان ہی تدبیروں اور کوششوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔

الغرض تقدیر میں صرف یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص کو فلاں چیز حاصل ہو جائیگی، بلکہ جس کوشش اور جس تدبیر سے وہ چیز اس دُنیا میں حاصل ہونے والی ہوتی ہے، تقدیر میں بھی وہ اسی تدبیر سے بندھی ہوئی ہے۔

بہر حال جیسا کہ عرض کیا گیا تقدیر میں اسباب ومسببات کا پورا سلسلہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ اس دنیا میں ہے۔ پس یہ خیال کرنا کہ تقدیر میں جو کچھ ہے وہ آپ سے آپ مل جائیگا، اور اس بناء پر اس عالم اسباب کی کوششوں اور تدبیروں سے دست بردار ہونا در اصل تقدیر کی حقیقت سے ناواقفی ہے۔ حدیث نمبر ۶۴، ۶۵ میں بعض صحابہؓ کے سوالات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا

حاصل بھی یہی ہے۔

الغرض اگر تقدیر کی پوری حقیقت سامنے رکھ لی جائے، تو انشاءاللہ اس قسم کا کوئی شبہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

مرنے کے بعد

برزخ، قیامت، آخرت

چند اصولی باتیں

مابعد الموت کے سلسلہ کی حدیثیں پڑھنے اور اُن کے مطالب سمجھنے سے پہلے چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں، ان باتوں کے مستحضر کر لینے کے بعد ان حدیثوں کے مضامین کے متعلق وہ وساوس، اور شبہات ان شاء اللہ پیدا نہ ہوں گے، جو حقیقت ناشناسی کی وجہ سے بہت سے دلوں میں اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

۱) انبیاء علیہم السلام کا خاص کام (جس کے لئے وہ مبعوث ہوتے ہیں) ہمیں ان باتوں کا بتلانا ہے، جن کے ہم ضرورت مند تو ہیں لیکن اپنے عقل و حواس سے بطور خود ہم ان کو نہیں جان سکتے۔ یعنی وہ ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

۲) انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی علم کا ایک خاص ذریعہ جو دوسرے عام انسانوں کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے، ان کو اسی ذریعہ سے ان چیزوں کا علم ہوتا ہے، جس کو ہم اپنی آنکھوں کانوں سے اور اپنی عقل و فہم سے دریافت نہیں کر سکتے، جس طرح دوربین رکھنے والا آدمی بہت دور کی وہ چیزیں دیکھ لیتا ہے، جن کو عام آدمی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

۳) کسی نبی کو نبی مان لینے، اور اس پر ایمان لانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا، اور پورے یقین کے ساتھ ان کو مان لیا اور قبول کر لیا، کہ وہ ایسی جو بات بتلاتا ہے جس کو ہم خود نہیں جانتے، اور نہیں دیکھتے، وہ اللہ کی وحی سے اس کا علم حاصل کر کے ہمیں بتلاتا ہے، اور وہ سب حرف بحرف صحیح ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۴) انبیاء علیہم السلام کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے، جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل اور ہمارے حواس بطور خود اس کو سمجھ لینے سے عاجز اور قاصر ہوں، بلکہ ایسا ہونا ضروری ہے، اگر انبیاء علیہم السلام صرف وہی باتیں بتلائیں جن کو ہم خود ہی غور و فکر سے معلوم کر سکتے ہوں، تو پھر ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔

۵) انبیاء علیہم السلام نے مابعد الموت یعنی عالم برزخ[1] (عالم قبر) اور عالم آخرت کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں ایسی چیزیں ضرور ہیں جن کو ہم اپنے غور و فکر سے از خود نہیں جان سکتے اور اس دنیا میں ان چیزوں کے نمونے نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کو اس طرح سمجھ بھی نہیں سکتے، جس طرح اس دنیا کی دیکھی بھالی چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

۶) علم کے جو عام فطری ذریعے اور وسیلے ہمیں دیئے گئے ہیں، مثلاً آنکھ، ناک، کان، عقل و فہم، ظاہر ہے کہ

۱۔ مرنے کے بعد سے قیامت تک کے دور کو عالم برزخ کہتے ہیں۔

ان کی طاقت اور ان کا دائرہ عمل بہت محدود ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید آلات کی خارجی مدد سے ان کے ذریعہ بہت سی وہ چیزیں ہمارے علم میں آجاتی ہیں جن کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ مثلاً: پانی میں یا خون میں جو جراثیم پائے جاتے ہیں، اب خوردبین کی مدد سے آنکھ ان کو دیکھ لیتی ہے، ریڈیو کی مدد سے کان ہزاروں میل دور تک کی آواز سن لیتے ہیں، اسی طرح کتابی معلومات کی مدد سے پڑھے لکھے انسان کی عقل اس سے زیادہ سوچ لیتی ہے، جتنا کہ آنکھ کان کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کی مدد سے سوچ سکتی تھی۔ اس تجربے سے معلوم ہوا کہ کسی حقیقت کا صرف اس بنیاد پر انکار کر دینا کہ آج ہم اس کو نہیں دیکھتے، نہیں سنتے، یا ہماری عقل اس کو نہیں سمجھتی، بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ○

۱ ـ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جسم جو ظاہر ہے اور نظر آتا ہے، دوسری روح جو اگرچہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی، لیکن اسکے ہونے کا ہم سب کو یقین ہے، پھر انسان کے ان دونوں جزوں کا باہمی تعلق اس دنیا میں اس طرح ہے کہ تکلیف و مصیبت، یا راحت و لذت کی جو کیفیت یہاں آتی ہے وہ براہ راست جسم پر آتی ہے، اور روح اس سے تبعاً متاثر ہوتی ہے، مثلاً: انسان کو چوٹ لگتی ہے، وہ زخمی ہوتا ہے، یا مثلاً وہ کہیں آگ سے جل جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ چوٹ اور آگ کا تعلق براہ راست اسکے جسم سے ہوتا ہے، لیکن اسکے اثر سے روح کو بھی دکھ ہوتا ہے، اسی طرح کھانے پینے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ بھی براہ راست جسم ہی کو ہوتی ہے، لیکن روح بھی اس سے لذت حاصل کرتی ہے۔

الغرض اس دنیا میں انسان کے وجود اور اسکے حالات میں گویا جسم اصل ہے اور روح اسکے تابع ہے، لیکن قرآن و حدیث میں عالم برزخ کے متعلق جو کچھ بتلایا گیا ہے اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا، یعنی اس عالم میں جس پر جو اچھی بری واردات ہوگی وہ براہ راست اس کی روح پر ہوگی، اور جسم اس سے تبعاً متاثر ہوگا، اللہ تعالیٰ نے (شاید اسی لئے کہ اس حقیقت کا سمجھنا ہمارے لئے آسان ہو جائے) اس دنیا میں بھی اس کا ایک نمونہ پیدا کر دیا ہے، اور وہ عالم رؤیا یعنی خواب ہے، عقل و ہوش رکھنے والا ہر انسان اپنی زندگی میں بار بار ایسے خواب دیکھتا ہے جن میں اس کو بڑی لذت ملتی ہے، یا بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن خواب میں یہ لذت یا تکلیف براہ راست دراصل روح کے لئے ہوتی ہے اور جسم تبعاً اس سے متاثر ہوتا ہے یعنی خواب میں آدمی مثلاً جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کوئی لذیذ کھانا کھا رہا ہے، تو صرف یہی نہیں دیکھتا کہ میری روح ہی کھا رہی ہے، یا خیالی قوت ہی کھا رہی ہے، بلکہ اس وقت وہ یہی دیکھتا ہے کہ بیداری کی طرح وہ اپنے اس جسم والے منہ سے کھا رہا ہے جس سے روزانہ کھایا کرتا ہے۔ اسی طرح خواب میں اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کو مارا، تو وہ یہ نہیں دیکھتا، کہ اس کی روح کو مارا گیا، بلکہ وہ اس وقت یہی دیکھتا ہے، کہ مار اسکے جسم پر پڑی ہے اور اسکے جسم پر اس وقت ویسی ہی چوٹ لگی، جیسی بیداری میں مار پڑنے سے لگتی ہے، حالانکہ واقعہ میں جو کچھ گذرتا ہے وہ خواب میں دراصل روح پر گذرتا ہے، اور جسم اس سے تبعاً متاثر ہوتا ہے، البتہ کبھی کبھی جسم کا یہ تاثر اتنا محسوس ہو جاتا ہے کہ آدمی بیدار ہونے کے بعد جس پر

اسکے نشانات اور اثرات بھی پاتا ہے۔ الغرض نیند کی حالت میں اچھے یا برے خواب دیکھنے والے شخص پر جو کچھ گذرتا ہے اس کی نوعیت یہی ہے کہ وہ براہ راست اور اصلی طور پر روح پر گذرتا ہے، اور جسم پر اس کا اثر تبعاً پڑتا ہے، اسی لئے خواب دیکھنے والے کے قریب والا آدمی بھی اسکے جسم پر کوئی واردات گذرتے ہوئے نہیں دیکھتا، کیونکہ ہم اس دنیا میں کسی انسان کے ان ہی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن کا تعلق براہ راست اسکے جسم سے ہو۔ پس عالم برزخ میں (یعنی مرنے کے بعد سے قیامت تک کے دور میں) اچھے برے انسانوں پر جو کچھ گذرنے والا ہے (جس کی بعض تفصیلات آگے آنے والی حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں) اس کی نوعیت بھی یہی ہے کہ وہ اصلی طور پر اور براہ راست روح پر گذرے گا، اور جسم تبعاً اس میں شریک ہوگا، اور عالم رؤیا (خواب) کے تجربات کی روشنی میں اس کو سمجھ لینا کسی سمجھنے والے آدمی کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

امید ہے کہ اس دنیا اور عالم برزخ کے اس فرق کو جان لینے کے بعد وہ عامیانہ اور جاہلانہ شبہے اور وسوسے پیدا نہ ہوں گے، جو قبر کے سوال وجواب اور عذاب وثواب کی حدیثوں کے متعلق بعض ضعیف الایمان اور کم عقل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

عالم برزخ (عالم قبر)

۷۱) عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ يَاتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ رَبِّىَ اللهُ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَادِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ دِيْنِىَ الْاِسْلَامُ، فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِىْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ وَمَا يُدْرِيْكَ؟ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللهِ فَآمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ، فَذَالِكَ قَوْلُهُ " يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الآيه" قَالَ فَيُنَادِىْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِىْ فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَالْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ لَهٗ، قَالَ فَيَاتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا وَيُفْتَحُ لَهٗ فِيْهَا مَدَّبَصَرِهٖ. وَاَمَّاالْكَافِرُ فَذَكَرمَوْتَهٗ قَالَ وَيُعَادُ رُوْحُهٗ فِىْ جَسَدِهٖ وَيَاتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ هَاه هَاه لَا اَدْرِىْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ هَاه هَاه لَا اَدْرِىْ، فَيَقُوْلَانِ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِىْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ هَاه هَاه لَااَدْرِىْ، فَيُنَادِىْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ كَذَبَ فَافْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَالْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَاتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ اَعْمٰى اَصَمُّ مَعَهٗ مِرْزَبَّةٌ مِنْ حَدِيْدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ۔ (رواہ احمد و ابو داؤد)

ترجمہ حضرت براء بن عازب سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے (ایک سلسلۂ کلام میں مردہ کے سوال وجواب اور عالم برزخ یعنی قبر کے ثواب وعذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے)

فرمایا کہ :(اللہ کا مؤمن بندہ اس دنیا سے منتقل ہو کر جب عالم برزخ میں پہنچتا ہے، یعنی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو،) اسکے پاس اللہ کے دو فرشتے آتے ہیں، وہ اس کو بٹھاتے ہیں، پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، پھر پوچھتے ہیں، کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے، پھر پوچھتے ہیں، کہ یہ آدمی جو تمہارے اندر (نبی کی حیثیت سے) کھڑا کیا گیا تھا، (یعنی حضرت محمد) ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کہتا ہے وہ اللہ کے سچے رسول ہیں، وہ فرشتے کہتے ہیں کہ تمہیں یہ بات کس نے بتلائی؟ (یعنی ان کے رسول ہونے کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟) وہ کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی (اسنے مجھے بتلایا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں) تو میں ایمان لایا، اور میں نے ان کی تصدیق کی (رسول اللہ فرماتے ہیں کہ) مؤمن بندہ کا یہی جواب ہے، جس کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ.

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو پکی پکی بات (یعنی صحیح عقیدہ اور صحیح جواب) کی برکت سے ثابت رکھے گا، دنیا میں اور آخرت میں۔

یعنی وہ گمراہی سے، اور اسکے نتیجہ میں آنے والے عذاب سے محفوظ رکھے جائیں گے۔

اسکے بعد رسول اللہ نے فرمایا: "مؤمن بندہ فرشتوں کے مذکورہ بالا سوالات کے جب اس طرح ٹھیک ٹھیک جوابات دے دیتا ہے) تو ایک ندا دینے والا آسمان سے ندا دیتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمان سے اعلان کرایا جاتا ہے) کہ میرے بندے نے ٹھیک بات کہی، اور صحیح صحیح جوابات دیئے، لہذا اس کے لئے جنت کا فرش کرو، اور جنت کا اس کو لباس پہناؤ، اور جنت کی طرف اس کے لئے ایک دروازہ کھول دو، چنانچہ وہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور اس سے جنت کی خوشگوار ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں، اور جنت میں اس کے لئے منتہائے نظر تک کشادگی کر دی جاتی ہے (یعنی پردے اس طرح اٹھا دیئے جاتے ہیں کہ جہاں تک اس کی نگاہ جائے، وہ جنت کی بہاروں اور اسکے نظاروں سے لذت اور فرحت حاصل کرتا رہے۔) (یہ حال تو رسول اللہ نے مرنے والے سچے اہل ایمان کا بیان فرمایا)، اس کے بعد ایمان نہ لانے والے (کافر) کی موت کا ذکر آپ نے کیا، اور فرمایا: (مرنے کے بعد) اس کی روح اسکے جسم میں لوٹائی جاتی ہے، اور اسکے پاس بھی دو فرشتے آتے ہیں، وہ اس کو بٹھاتے ہیں، اور اس سے بھی پوچھتے ہیں، کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ (خداناشناس) کہتا ہے: "ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا" پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ دین تیرا کیا تھا؟ وہ کہتا ہے، کہ "ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا"۔ پھر فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ یہ آدمی جو تمہارے اندر (بحیثیت نبی کے) مبعوث ہوا تھا، تمہارا اسکے بارے میں کیا خیال تھا؟ وہ پھر بھی یہی کہتا ہے: "ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا"۔ (اس سوال و جواب کے بعد) آسمان سے ایک ندا دینے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکارتا ہے کہ اسنے جھوٹ کہا (یعنی اسنے فرشتوں کے سوال کے جواب میں اپنا بالکل انجان اور بے جُرم ہونا ظاہر کیا یہ اسنے جھوٹ بولا، کیونکہ واقعے میں وہ

اللہ کی توحید کا، اسکے دین اسلام کا اور اسکے رسول برحق کا منکر تھا) پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی ندا کرے گا کہ اس کے لئے دوزخ کا فرش کرو، اور دوزخ کا اس کو لباس پہناؤ، اور اس کے لئے دوزخ کا ایک دروازہ کھول دو (چنانچہ یہ سب کچھ کر دیا جائے گا) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، کہ: "(دوزخ کے اس دروازے سے) اسکو برابر دوزخ کی گرمی اور دوزخ کی لپٹیں اور جلانے جھلسانے والی ہوائیں اسکے پاس آتی رہیں گی اور اسکی قبر اس پر نہایت تنگ کر دی جائیگی جسکی وجہ سے (اتنا دباؤ پڑے گا، کہ) اسکے سینے کی پسلیاں ادھر سے ادھر ہو جائیں گی، پھر اس کو عذاب دینے کیلئے ایک ایسا فرشتہ اس پر مسلط کیا جائے گا، جو نہ کچھ دیکھے گا، نہ سنے گا، اسکے پاس لوہے کی ایسی مونگری ہوگی، کہ اگر اسکی ضرب کسی پہاڑ پر لگائی جائے تو وہ بھی مٹی کا ڈھیر ہو جائے، وہ فرشتہ اس مونگری سے اس پر ایک ضرب لگائے گا، جس سے وہ اس طرح چیخے گا، جس کو جن وانس کے علاوہ وہ سب چیزیں سنیں گی، جو مشرق اور مغرب کے درمیان ہیں، اس ضرب سے وہ خاک ہو جائے گا، اسکے بعد اس میں پھر روح ڈالی جائے گی۔ (مسند احمد، ابوداؤد)

۷۲) **عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِىْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ اِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِىْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهٗ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ اَبْدَلَكَ اللهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا وَاَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهٗ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِىْ هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِىْ كُنْتُ اَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهٗ مَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ.**

(رواہ البخاری و مسلم واللفظ للبخاری)

ترجمہ: انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ (مرنے کے بعد) بندہ جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے، اور اسکے ساتھ (یعنی اسکے جنازے کے ساتھ آنے والے) واپس چل دیتے ہیں، (اور ابھی وہ اتنے قریب ہوتے ہیں کہ) ان کی جوتیوں کی چاپ وہ سن رہا ہوتا ہے تو اسی وقت اسکے پاس دو فرشتے آتے ہیں، وہ اسکو بٹھاتے ہیں، پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ان کا یہ سوال رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہوتا ہے۔ پس جو سچا مؤمن ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ (میں گواہی دیتا رہا ہوں، اور اب بھی) میں گواہی دیتا ہوں، کہ وہ اللہ کے بندے، اور اسکے رسول برحق ہیں، (یہ جواب سن کے) فرشتے اس سے کہتے ہیں (ایمان نہ لانے کی صورت میں) دوزخ میں جو تمہاری جگہ ہونے والی تھی، ذرا اس کو دیکھ لو، اب اللہ نے بجائے اسکے، تمہارے لئے جنت میں ایک جگہ عطا فرمائی ہے (اور وہ یہ ہے) اس کو بھی دیکھ لو (یعنی دوزخ اور جنت کے دونوں مقام اسکے سامنے کر دیئے جائیں گے) چنانچہ وہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ اور جو منافق اور کافر ہوتا ہے، تو اسی طرح (مرنے کے بعد) اس سے بھی (رسول اللہ ﷺ) کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے تھے؟ (اور اس کو کیا اور کیسا سمجھتے تھے؟) پس وہ منافق اور کافر کہتا ہے کہ میں ان کے بارے میں خود تو کچھ جانتا نہیں، دوسرے

لوگ جو کہا کرتے تھے، وہی میں بھی کہتا تھا۔ (اسکے اس جواب پر) اس کو کہا جائے گا، کہ تو نے نہ تو خود جانا اور نہ (جان کر ایمان لانے والوں کی) تو نے پیروی کی، اور لوہے کے گرزوں سے اسکو مارا جائے گا، جس سے وہ اس طرح چیخے گا کہ جن وانس کے علاوہ اسکے آس پاس کی ہر چیز اس کا چیخنا سنے گی۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: پہلی حدیث سے معلوم ہوا تھا، کہ مرنے والے سے فرشتے تین سوال کرتے ہیں، اور اس دوسری حدیث میں صرف ایک ہی سوال کا ذکر کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ سوال چونکہ باقی دونوں سوالوں پر بھی حاوی ہے، اور اسکے جواب سے ان دونوں سوالوں کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے، اسلئے بعض حدیثوں میں صرف اسی ایک سوال کا ذکر کر دیا جاتا ہے، قرآن و حدیث کا طریق بیان یہی ہے کہ ایک واقعہ کو کبھی تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور کبھی صرف اسکے بعض اجزاء ہی بیان کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ اصولی بات پہلے بھی ذکر کی گئی ہے، اور اب پھر اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں تصنیفی مقالات نہیں ہیں، بلکہ عموماً مجلسی ارشادات ہیں، اور کسی معلم اور مربی کے مجلسی ارشادات میں ایسا ہونا کہ کبھی ایک بات کو پوری تفصیل سے بیان کیا جائے، اور کبھی اسکے صرف بعض اجزاء کا ذکر کر دیا جائے، بالکل صحیح اور فطری بات ہے۔

حضرت انس والی اس دوسری حدیث میں اس سوال جواب کے سلسلے میں قبر کا لفظ بھی آیا ہے اور اسی طرح بعض اور حدیثوں میں بھی قبر کا ذکر ہے، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ سوال و جواب صرف ان ہی مُردوں سے مخصوص ہے، جو قبروں میں دفن ہوتے ہیں، دراصل قبر کا ذکر ان حدیثوں میں صرف اس لئے کر دیا گیا ہے کہ وہاں مُردوں کو قبروں ہی میں دفن کرنے کا عام رواج تھا، اور لوگ صرف اسی طریقے کو جانتے تھے، ورنہ اللہ کے فرشتوں کی طرف سے یہ سوال و جواب ہر مرنے والے سے ہوتا ہے، خواہ اس کا جسم قبر میں دفن کیا جائے، خواہ دریا میں بہایا جائے، خواہ آگ میں جلایا جائے، خواہ گوشت خور جانوروں کے پیٹ میں چلا جائے۔ اور جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے یہ سب کچھ براہ راست اور اصلی طور سے روح کے ساتھ ہوتا ہے اور جسم خواہ کہیں ہو، اور کسی حال میں ہو، وہ تبعاً اس سے متأثر ہوتا ہے، اور خواب کی مثال اسکے سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ اور خواب ہی کی مثال سے اس شبہ کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مردہ دو چار دن تک ہمارے سامنے پڑا رہتا ہے اور اس سوال و جواب کی آواز اسکی لاش سے کوئی نہیں سنتا، اور نہ اس پر عذاب یا ثواب کا کوئی اثر معلوم ہوتا ہے۔ پس یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ خواب میں ایک آدمی پر سب کچھ گذر جاتا ہے، وہ بات چیت کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، لیکن اسکے برابر والوں کو کچھ بھی نہیں نظر آتا۔

اسی قسم کے عامیانہ اور جاہلانہ شبہوں میں سے قبر کے اس سوال و جواب پر ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ قبر میں جانے کے لئے جب کوئی اور راستہ اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا روزن بھی نہیں ہوتا، تو فرشتے اس میں جاتے کس طرح ہیں؟ یہ شبہ دراصل ان حقیقت ناشناسوں کو ہوتا ہے جو فرشتوں کو شاید اپنی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی مادی مخلوق سمجھتے ہیں، اصل واقعہ یہ ہے کہ فرشتوں کے کہیں پہنچنے کے لئے دروازے یا کھڑکی کی ضرورت نہیں، ہماری نگاہیں یا آفتاب کی شعاعیں جس طرح شیشوں میں سے نکل جاتی

ہیں اسی طرح فرشتے اپنے وجود کی لطافت اور اللہ کی دی ہوئی قدرت سے پتھروں میں سے بھی پار ہو جاتے ہیں۔ سبحانہ تعالیٰ شانہ،۔

۷۳) **عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ فَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ.** (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ تم میں سے کوئی جب مر جاتا ہے تو ہر صبح و شام اسکے سامنے اس کا ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ جنتیوں میں سے ہے، تو جنتیوں کے مقام میں سے (اس کا جو مقام ہونے والا ہوتا ہے وہ ہر صبح و شام اسکے سامنے کیا جاتا ہے، اور اسکو دکھلایا جاتا ہے) اور اگر وہ مرنے والا دوزخیوں میں سے ہوتا ہے تو (اسی طرح صبح و شام) دوزخیوں کے مقامات میں سے (اس کا مقام اسکے سامنے کیا جاتا ہے) اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہونے والا تیرا مستقل ٹھکانا (اور یہ اسوقت ہوگا) جبکہ اللہ تجھے اپنی طرف اٹھائیگا قیامت کے دن۔

تشریح...... قبر میں روزانہ صبح و شام جنتیوں کو اپنا مقام دیکھ کر جو غیر معمولی لذت و مسرت حاصل ہوا کرے گی، اور دوزخیوں کو دوزخ کو اپنا ٹھکانا دیکھ کر روزانہ صبح شام جو رنج و غم مزید ہوا کرے گا، اس دنیا میں کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اہل جنت میں شامل فرمائے۔

۷۴) **عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهُ كَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهُ فَقِيْلَ لَهُ تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِيْ وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْاٰخِرَةِ فَاِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ اَيْسَرُ مِنْهُ وَ اِنْ لَّمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ اَشَدُّ مِنْهُ، قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَاَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ اِلَّا وَالْقَبْرُ اَفْظَعُ مِنْهُ.** (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (کہ انکا حال یہ تھا) کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو بہت روتے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہو جاتی، ان سے پوچھا گیا (یہ کیا بات ہے) کہ آپ جنت و دوزخ کو یاد کرتے ہیں تو نہیں روتے اور قبر کی وجہ سے اس قدر روتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا، کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، پس اگر بندہ اس سے نجات پا گیا، تو آگے کی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہیں، اور اگر قبر کی منزل سے بندہ نجات نہ پا سکا، تو اسکے بعد کی منزلیں اس سے اور زیادہ سخت اور کٹھن ہیں۔ نیز رسول اللہ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے، کہ: نہیں دیکھا میں نے کوئی منظر مگر یہ کہ قبر کا منظر اس سے زیادہ خوفناک اور شدید ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ جب کسی قبر سے میرا گذر ہوتا ہے، تو قبر کے بارے میں حضور ﷺ کے یہ ارشادات یاد آجاتے ہیں، اور فکر و غم میں مبتلا کر کے مجھے رلاتے ہیں۔

۷۵) عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنه قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اِسْتَغْفِرُوْا لاَ خِيْكُمْ ثُمَّ سَلُوْالَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَاِنَّهُ الْاٰنَ يُسْأَلُ. (رواہ ابو داؤد)

حضرت عثمانؓ ہی سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا، کہ جب میت کے دفن سے فارغ ہو جاتے، تو قبر کے پاس کھڑے ہوتے اور فرماتے، کہ اپنے اس بھائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دُعا کرو، اور یہ بھی استدعا کرو، کہ اللہ تعالیٰ اس کو سوالوں کے جواب میں ثابت قدم رکھے، کیونکہ اس وقت اس سے پوچھ گچھ ہو گی۔

۷۶) عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلٰى سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّيَ فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِيْلاً ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ فَقَالَ لَقَدْ تَضَايَقَ عَلٰى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ. (رواہ احمد)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب (مشہور انصاری صحابی) سعد بن معاذ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اُن کے جنازے پر گئے، پھر جب رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور ان کو قبر میں اتار کر جب قبر برابر کر دی گئی، تو رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہا (آپ کو دیکھ کر آپ کی اتباع میں) ہم بھی دیر تک سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے رہے، پھر آپ نے اللہ اکبر، اللہ اکبر کہنا شروع کیا، تو ہم بھی آپ کے اتباع میں اللہ اکبر، اللہ اکبر کہنے لگے۔ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ "یا رسول اللہ! اس وقت آپ کی اس تسبیح اور تکبیر کا کیا خاص سبب تھا؟ آپ نے فرمایا کہ: "اللہ کے اس نیک بندے پر اس کی قبر تنگ ہوئی تھی (جس سے اس کو تکلیف تھی) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تنگی کی اس کیفیت کو دور فرما کر کشادگی پیدا فرما دی، اور اس کی تکلیف دور کر دی۔

تشریح ...... یہ سعد بن معاذ انصاریؓ رسول اللہ ﷺ کے مشہور اور ممتاز اصحاب کرام میں سے تھے، غزوۂ بدر کی شرکت کی فضیلت اور سعادت بھی انہیں حاصل تھی، ۵ھ میں ان کا وصال ہوا، اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا: "ستر ہزار فرشتوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی، اور آسمان کے دروازے ان کیلئے کھولے گئے۔ باوجود اسکے قبر کی تنگی کی تکلیف سے ان کو بھی واسطہ پڑا (اگرچہ فوراً ہی وہ اٹھالی گئی)۔ اس میں ہم جیسوں کیلئے بڑا انتباہ اور بڑا سبق ہے۔ اللّٰھم ارحمنا اللّٰھم احفظنا

۷۷) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطِيْبًا فَذَكَرَ فِتْنَةَ الْقَبْرِالَّتِيْ يُفْتَنُ فِيْهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذَالِكَ ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً. (رواہ البخاری)

حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت ہے، کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا، اور اس میں اس آزمائش کا ذکر فرمایا، جس میں مرنے والا آدمی مبتلا ہوتا ہے تو جب آپ نے اس کا ذکر فرمایا، تو خوف ودہشت سے سب مسلمان چیخ اُٹھے اور ایک کہرام مچ گیا۔

۷۸) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ اِذْ حَادَتْ بِهٖ فَكَادَتْ تُلْقِيْهِ وَاِذَا اَقْبُرٌ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ اَصْحَابَ هٰذِهِ الْاَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتٰى مَاتُوْا قَالَ فِي الشِّرْكِ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا اَنْ لَا تَدَافَنُوا الدَعَوْتُ اللهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ اَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت زید بن ثابت انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنی خچری پر سوار قبیلہ بنی نجار کے ایک باغ میں سے گزر رہے تھے، اچانک آپ کی خچری راستے سے ہٹی، اور ٹیڑھی ہوئی (اور اسکی ایسی حالت ہوئی) کہ قریب تھا کہ آپ کو گرادے، اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ وہاں چھ یا پانچ قبریں ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان قبر کے مردوں سے کون واقف ہے؟ (یعنی تم میں کوئی ہے جو ان لوگوں کو جانتا ہو، جو ان قبروں میں مدفون ہیں) ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا: میں جانتا ہوں، آپ نے فرمایا: یہ لوگ کس زمانے میں مرے تھے؟ اس شخص نے عرض کیا: زمانہ شرک میں۔ آپ نے فرمایا: یہ لوگ اپنی قبروں میں عذاب میں مبتلا ہیں، اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن نہ کر سکو گے، تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ قبر کے عذاب میں جتنا کچھ میں سن رہا ہوں وہ اس میں سے کچھ تم کو بھی سنا دے۔ یہ فرمانے کے بعد آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا: (دوزخ کے عذاب سے اللہ سے پناہ مانگو: سب کی زبان سے نکلا: ہم دوزخ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ سب نے کہا: ہم قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، آپ نے فرمایا: سب فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو، ظاہری فتنوں سے بھی، اور باطنی فتنوں سے بھی۔ سب نے کہا: ہم سب ظاہری و باطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، کہ دجال کے (عظیم ترین) فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو۔ سب نے کہا: "ہم دجالی فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں"۔ (مسلم)

تشریح ...... اس سلسلہ کی بعض حدیثوں سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے برزخ (قبر) کے عذاب کو جن وانس سے مخفی رکھا ہے، ان کو اس کا بالکل پتہ نہیں چلتا، لیکن انکے علاوہ دوسری مخلوقات کو اس کا ادراک واحساس کچھ ہوتا ہے، اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ بنی نجار کے اس باغ میں جن لوگوں کی وہ چند قبریں تھیں ان پر جو عذاب ہو رہا تھا، رسول اللہ ﷺ کے اصحاب و رفقاء کو اگرچہ اس کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ لیکن جس خچری پر آپ سوار تھے، اس کو اس کا احساس ہوا اور اس پر اثر پڑا۔ اس کی حکمت ظاہر ہے، مرنے والوں پر مرنے کے بعد جو کچھ گذرتا ہے، اگر ہم سب بھی اسکو دیکھ یا سن لیا کرتے، تو "ایمان بالغیب" نہ رہتا اور دنیا کا یہ نظام بھی نہ چل سکتا، جس وقت ہمارے سامنے ہمارا کوئی عزیز سخت تکلیف اور مصیبت میں

مبتلا ہو، ہم سے اس وقت کوئی کام نہیں ہو سکتا، اگر کہیں قبروں کا عذاب ہم پر منکشف ہو جایا کرتا، تو کسی اور کام کا کیا ذکر، مائیں بچوں کو دودھ بھی نہ پلا سکتیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ ان قبر والوں پر جو عذاب ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے جو چیخ پکار ان قبروں میں مچی ہوئی تھی، جس کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والے صحابہ کرامؓ بالکل نہیں سن رہے تھے، خود آپ اس کو سن رہے تھے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ وحی کا فرشتہ جب وحی لے کر آتا تھا، تو بسا اوقات صحابۂ کرامؓ بھی اس وقت آپ کے قریب ہوتے تھے، لیکن آنے والے فرشتے کو ان کی آنکھیں عام طور سے نہیں دیکھ سکتی تھیں، نہ وہ اس کی آواز سنتے تھے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اس کو دیکھتے اور اسکی آواز سنتے تھے، اہل مکاشفہ تو اس صورت حال کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن ہم جیسے عام بھی اس کو خواب والی مثال ہی سے کچھ سمجھ سکتے ہیں[1]۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ:

لَوْلَا اَنْ لَا تَدَا فَنُوْا لَدَعَوْتُ اللهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِىْ اَسْمَعُ مِنْهُ

(یعنی اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن نہ کر سکو گے، تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا، کہ قبر کے عذاب میں سے جتنا کچھ میں سن رہا ہوں، اس میں سے کچھ وہ تم کو بھی سنا دے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر کے عذاب کی جو کیفیت اللہ تعالیٰ نے مجھ پر منکشف فرمادی ہے، اور عذاب اور عذاب دیئے جانے والوں کی چیخ و پکار، جو میں سن رہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ وہ تمہیں بھی سنوادے، تو اس کا خطرہ ہے کہ تمہیں موت سے اتنی دہشت ہو جائے کہ مردوں کو دفن و کفن کا انتظام بھی نہ کر سکو، اس لئے میں اللہ سے دعا نہیں کرتا، کہ وہ تمہیں بھی سنا دے۔

اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو تعوذ (اللہ سے پناہ مانگنے) کی طرف متوجہ کیا۔ اس میں اس کی تعلیم ہے کہ مؤمنین کو چاہیے، کہ وہ قبر کے عذاب کو جاننے اور دیکھنے کی فکر کے بجائے اس سے بچنے کی فکر کریں، اور اس سے...... اور ہر قسم کے عذاب اور فتنہ سے بچانے والا بس اللہ ہی ہے، لہٰذا اس سے برابر پناہ مانگتے

---

[1] عام سنۃ اللہ اور عادۃ اللہ یہی ہے، کہ برزخ کی واردات کو جن و انس سے کلی طور پر مخفی رکھا جاتا ہے، نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں، لیکن یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بطور خرق عادت کے کسی مرنے والے کے برزخی عذاب یا ثواب کی کوئی جزوی کیفیت کسی، اور مصلحت کی بنا پر اپنے کسی بندے کو دکھلا دے۔ شیخ ابن القیم نے "کتاب الروح" میں بڑے عبرت انگیز اس قسم کے بہت سے واقعات قریباً ۵،۶ صفحے پر نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "وهذه الاخبار واضعا فها واضعاف اضعافها ممالا يتسع لها الكتاب مما اراه الله سبحانه بعض عباده من عذاب القبر ونعيمه عيانا واما رؤية المنام فلو ذكرنا ها لجاء ت عدة اسفار ...... وليس عند الملاحدة والزنا دقة الاالتكذيب بمالم يحيطوا بعلمه". (کتاب الروح ص ۱۱۲)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعات جو میں نے یہاں ذکر کئے اس قسم کے اور بھی بیشمار واقعات ہیں جن کی اس کتاب میں گنجائش نہیں، یہ سب اسی قبیل سے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو قبر کے عذاب یا ثواب کا بھی مشاہدہ بھی کرادیتا ہے، یعنی بیداری کی حالت میں آنکھوں سے دکھادیتا ہے۔ رہا خواب میں دیکھنا تو اسکے واقعات تو اتنے ہیں کہ اگر ان کو لکھا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں...... لیکن ملحد اور زندیق قسم کے لوگوں کا حال یہی ہے کہ جن حقیقتوں سے وہ نا آشنا اور جن کے علم و عرفان سے وہ محروم ہیں، ان کو جھٹلاتے اور انکار کرتے ہیں۔ ۱۱۲

رہیں، دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگیں عذابِ قبر سے پناہ مانگیں، ظاہر و باطن کے سب فتنوں سے پناہ مانگیں خاص کر دجّال کے عظیم فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے رہیں۔ اور کفر و شرک اور ان سب فتنوں اور معصیتوں سے بچنے کی فکر رکھیں جو عذاب کو لانے والے ہیں۔ اللّٰھم انا نعوذ بك من عذاب القبر ونعوذ بك من عذاب النار ونعوذ بك من الفتن ما ظھر منھا وما بطن ونعوذ بك من فتنة الدجال.

قیامت

۷۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بُعِثْتُ اَنَاوَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح...... یعنی آنحضرت ﷺ نے کلمۂ شہادت والی انگلی، اور اسکے برابر والی بیچ کی انگلی ملا کر فرمایا: میری بعثت میں اور قیامت میں اتنا قرب اور اتصال ہے جتنا کہ ان دو انگلیوں میں۔ اس سے غالباً آپ کا مطلب یہ تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے جتنے دور مقرر کئے تھے وہ سب ختم ہو گئے، اب یہ دور اس کا آخری دور ہے جو میری بعثت سے شروع ہوا ہے، اور قیامت پر ختم ہو گا، میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، نہ کوئی نئی امت پیدا ہو گی، اسلئے اس کو بہت دور سمجھ کر اسکی طرف سے بے فکر اور بے پروانہ ہونا چاہئے۔

۸۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ هٰذِهِ الدُّنْيَا مِثْلُ ثَوْبٍ شُقَّ مِنْ اَوَّلِهٖ اِلٰى اٰخِرِهٖ فَبَقِيَ مُتَعَلِّقًا بِخَيْطٍ فِيْ اٰخِرِهٖ فَيُوْشَكُ ذَالِكَ الْخَيْطُ اَنْ يَّنْقَطِعَ۔

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

ترجمہ انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ: "اس دنیا کی مثال اس کپڑے کی سی ہے جو اول سے آخر تک پھاڑ دیا گیا اور بس سرے پر ایک دھاگے سے وہ جڑا رہ گیا، اور یہ آخری دھاگا بھی بس عنقریب ٹوٹنا ہی چاہتا ہے۔" (شعب الایمان للبیہقی)

تشریح...... پہلی حدیث کی طرح اس حدیث میں بھی قیامت کا قریب ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور مقصد یہی ہے کہ قیامت کو بہت دور سمجھ کے اس کی طرف سے غفلت نہ کی جائے، بلکہ اس کو بہت قریب اور ناگہانی پیش آنے والا ایک عظیم حادثہ یقین کرتے ہوئے ہر وقت اسکی فکر اور اس کیلئے تیاری کی جائے۔

۸۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتَ بِشَهْرٍ تَسْاَلُوْنِّيْ عَنِ السَّاعَةِ وَاِنَّمَاعِلْمُهَاعِنْدَاللهِ وَاُقْسِمُ بِاللهِ مَاعَلَى الْاَرْضِ مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوْسَةٍ يَاتِى عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ وَهِيَ حَيَّةٌ يَوْمَئِذٍ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ اپنی وفات شریف سے ایک مہینہ پہلے فرماتے تھے، کہ: "تم لوگ مجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہو، اور اس کا (یعنی اسکے معین وقت کا)

علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور میں اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں ہے کہ اس پر سو سال گذریں اور وہ اس وقت تک زندہ باقی رہے"۔ (مسلم)

تشریح ..... قرآن پاک سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حدیثوں سے بھی، کہ بہت سے لوگ رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے متعلق دریافت کرتے تھے، کہ وہ کب آئے گی؟ آپ ہمیشہ اسکے جواب میں وہی فرماتے تھے جو اس حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، یعنی یہ کہ اسکے مقررہ وقت کا علم اللہ ہی کو ہے، یعنی وہی جانتا ہے، کہ کس سن کے کس مہینے کی کس تاریخ کو آئے گی، اس کا علم اس نے کسی اور کو نہیں دیا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس جواب کے علاوہ اور اصل سوال سے زائد ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ اس وقت جو لوگ روئے زمین پر زندہ ہیں، وہ سب سو سال کے اندر اندر ختم ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کبریٰ جس میں یہ سارا عالم ختم ہو جائے گا، اس کا معین وقت تو مجھے معلوم نہیں، بس اللہ ہی کو اس کا علم ہے، ہاں! اللہ نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے کہ اس نسل اور اس قرن کا خاتمہ سو سال تک ہو جائے گا، اور جو لوگ اس وقت زندہ ہیں، وہ سو سال پورے ہونے تک ختم ہو جائینگے، اس لئے یوں سمجھو کہ تمہاری قیامت تو اس صدی کے اندر ہی اندر آ جائے گی۔

۸۲) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى اَحَدٍ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ (ایسا برا وقت نہ آجائے کہ) بالکل نہ کہا جائے دنیا میں اللہ اللہ۔ اور اسی حدیث کو بعض راویوں نے اس طرح نقل کیا ہے کہ: "قیامت نہیں قائم ہوگی کسی ایسے شخص پر، جو کہتا ہو اللہ اللہ" ❶ (مسلم)

تشریح ..... یہ ہے کہ قیامت اس وقت آئیگی جبکہ دنیا اللہ کی یاد سے اور اللہ کو یاد کرنے والوں سے بالکل ہی خالی ہو جائیگی اور اللہ کی عبدیت اور فرمانبرداری، اور اللہ کے ساتھ بندگی کے صحیح تعلق کا دنیا سے بالکل خاتمہ ہو جائیگا۔ جب ایسا وقت آئیگا، اس وقت یہ پورا عالم فنا کر دیا جائے گا، گویا اللہ کا ذکر اور اللہ کے ساتھ بندگی کا صحیح تعلق اس عالم کی روح اور اسکے باقی رہنے کیلئے وجہ جواز ہے، جس دن ہماری یہ دنیا اس سے بالکل خالی ہو جائے گی، اسی دن اپنے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کے حکم سے توڑ پھوڑ کے برابر کر دی جائے گی۔

۸۳) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ الْخَلْقِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "قیامت نہیں قائم ہوگی، مگر بدترین آدمیوں پر"۔ (مسلم)

---

❶ بعض علماء کرام نے اس حدیث سے ذکر اسم ذات کی صحت اور اسکے ماثور ہونے پر استدلال کیا ہے، اور بلاشبہ یہ استدلال بہت صاف اور صحیح ہے۔ اللہ کی رحمت ہو حافظ ابن تیمیہ پر، اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ان کی نظر غالباً اس حدیث کی طرف گئی نہیں۔ ۱۲

تشریح مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تعلق رکھنے والے اچھے لوگ جب سب ختم ہو جائینگے اور یہ دنیا جب صرف بد کرداروں اور خدا فراموشوں ہی کی دنیا رہ جائے گی، تب اللہ کے حکم سے قیامت آ جائے گی۔

۸۴) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَيَمْكُثُ اَرْبَعِيْنَ لَا اَدْرِیْ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْ شَهْرًا اَوْعَامًا فَيَبْعَثُ اللهُ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَاَنَّهٗ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ فَيَطْلُبُهٗ ثُمَّ يَمْكُثُ فِی النَّاسِ سَبْعَ سِنِيْنَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ رِيْحًا بَارِدَةً مِنَ الشَّامِ فَلَا يَبْقٰى عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ اَوْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ دَخَلَ فِیْ كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ، حَتّٰى تَقْبِضَهٗ قَالَ فَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ فِیْ خِفَّةِ الطَّيْرِ وَاَحْلَامِ السِّبَاعِ لَا يَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ الشَّيْطَانُ فَيَقُوْلُ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ فَيَقُوْلُوْنَ فَمَا تَاْمُرُنَا فَيَاْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَهُمْ فِیْ ذٰلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ حَسَنٌ عَيْشُهُمْ ثُمَّ يُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَلَا يَسْمَعُهٗ اَحَدٌ اِلَّا اَصْغٰى لِيْتًا وَرَفَعَ لِيْتًا قَالَ وَاَوَّلُ مَنْ يَسْمَعُهٗ رَجُلٌ يَلُوْطُ حَوْضَ اِبِلِهٖ فَيَصْعَقُ وَيَصْعَقُ النَّاسُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ مَطَرًا كَاَنَّهُ الطَّلُّ فَيَنْبُتُ مِنْهُ اَجْسَادُ النَّاسِ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُوْنَ ثُمَّ يُقَالُ يَا اَيُّهَا النَّاسُ هَلُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ فَيُقَالُ اَخْرِجُوْا بَعْثَ النَّارِ فَيُقَالُ مِنْ كَمْ كَمْ؟ فَيُقَالُ مِنْ كُلِّ اَلْفٍ تِسْعَمِائَةٍ وَتِسْعِيْنَ. قَالَ فَذٰلِكَ يَوْمَ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا. وَذٰلِكَ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(قیامت سے پہلے) دجال کا خروج ہوگا، اور وہ ٹھہرے گا چالیس تک" (اس حدیث کو روایت کرنے والے صحابی عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ) میں نہیں جانتا کہ حضور (ﷺ) کا مطلب چالیس سے چالیس دن تھے، یا چالیس مہینے، یا چالیس سال۔ آگے حدیث بیان کرتے ہیں، کہ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو (اس دنیا میں) بھیجیں گے، گویا کہ وہ عروہ بن مسعود ہیں (یعنی ان کی شکل و صورت عروہ بن مسعود ثقفی سے بہت ملتی جلتی ہوگی) وہ دجال کو تلاش کریں گے (اور اس کا تعاقب کریں گے، اور اس کو پاکر) اس کا خاتمہ کردیں گے۔ پھر (دجال کا خاتمہ کردینے کے بعد) سات سال تک وہ اس دنیا کے لوگوں اور ان کے ساتھ رہیں گے، اور (ان کی برکت سے لوگوں میں ایسا اتحاد و اتفاق ہو جائے گا، کہ) دو آدمی بھی ایسے نہیں رہیں گے جن میں باہم عداوت اور دشمنی ہو، پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے (ایک خاص قسم کی) ٹھنڈی ہوا چلائے گا، جسکا اثر یہ ہوگا، کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نیکی ہو، یا فرمایا: کہ ذرہ برابر ایمان ہو، (بہر حال اس ہوا سے تمام اہل ایمان، اور اہل خیر ختم ہو جائیں گے[۱]) یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پہاڑ کے اندر چلا جائے گا، تو یہ ہوا وہیں پہنچ کر اس کا خاتمہ کرے گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ اسکے بعد صرف خراب آدمی ہی دنیا میں رہ جائیں گے (جن کے دل ایمان اور نیکی سے بالکل خالی ہوں گے) ان میں پرندوں والی تیزی اور پھرتی، اور درندوں والا ذہن جمع ہوگا (اس کا مطلب بظاہر یہ

---

[۱] یہ ہوا اہل ایمان کے لئے رحمت کی ہوا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے بھیجی جائے گی کہ سب اچھے بندوں کو قیامت سے پہلے اٹھا لیا جائے تاکہ وہ قیامت کے شدائد سے محفوظ رہیں ۱۲

ہے، کہ ان میں ظلم اور سفاکی تو درندوں کی سی ہو گی، اور اپنے ظالمانہ مقاصد اور اپنی ناپاک خواہشات کو پورا کرنے میں وہ ہلکے پھلکے برق رفتار پرندوں کی طرح تیز رو، اور پھرتیلے ہوں گے) نیکی اور بھلائی سے وہ مانوس نہ ہوں گے اور برائی کو وہ برائی نہ سمجھیں گے، (نہ اس کی مذمت کریں گے) پس شیطان ایک شکل بنا کر ان کے سامنے آئے گا، اور ان سے کہے گا، کیا تم شرم و حیا نہیں کرو گے، وہ کہیں گے کہ تم ہم کو کیا حکم دیتے ہو؟ (یعنی تم جو کہو، وہ ہم کریں) پس شیطان انہیں بتوں کی پرستش کا حکم دے گا (اور وہ اس کا اتباع کریں گے) اور وہ اس حال میں ہونگے، کہ رزق کی افراط اور بارش ہو گی، اور دنیوی زندگی بظاہر بڑی اچھی (عیش و نشاط والی زندگی) ہو گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا، پس جو کوئی اس کو سنے گا، اس کی جانبِ گردن ایک طرف کو جھک جائے گی اور ایک طرف کو اٹھ جائے گی (یعنی سر جسم پر سیدھا قائم نہ رہے گا، بلکہ ادھر یا ادھر کو لٹک جائے گا، جیسا کہ اس شخص کا حال ہو جاتا ہے جس پر اچانک کوئی ایسا دورہ پڑے جس سے اسکے رگ پٹھے بیکار اور بے جان ہو جائیں) اور سب سے پہلے جو شخص صور کی آواز سنے گا (اور جس پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑے گا) وہ ایک آدمی ہو گا، جو اپنے اونٹ کے حوض کو مٹی سے درست کر رہا ہو گا، پس وہ بے ہوش اور بے جان ہو کر گر جائے گا (یعنی مر جائے گا) اور دوسرے سب لوگ بھی اسی طرح بے جان ہو کر گر جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ (ایک ہلکی سی) بارش بھیجے گا، گویا کہ وہ شبنم ہے، اس کے اثر سے انسانوں کے جسموں میں روئیدگی آجائے گی پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ تو ایک دم سب کے سب کھڑے ہوں گے دیکھتے ہوں گے، پھر کہا جائے گا، کہ اے لوگو! اپنے مالک اور رب کی طرف چلو (اور فرشتوں کو حکم ہو گا، کہ) انہیں (حساب کے میدان میں) کھڑا کرو، ان سے پوچھا جائے گا (اور انکے اعمال کا حساب کتاب ہو گا) پھر حکم ہو گا، کہ ان میں سے دوزخ کی فوج نکالو، عرض کیا جائے گا، کہ کتنے میں سے کتنے؟ حکم ہو گا، کہ ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ہو گا وہ دن، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہی ہے دن سخت مصیبت اور مشقت کا۔ (مسلم)

تشریح ...... اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خروج دجال سے لیکر حشر تک کے بلکہ میدانِ حساب میں جمع ہونے تک کے، بعض واقعات کا تذکرہ فرمایا ہے، اس طرح کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں، جن میں قیامت سے پہلے ہونے والے بعض اہم واقعات، اور قیامت اور اسکے بعد کی منزلوں کا بیان اس سے بھی زیادہ اجمال کے ساتھ، یا اس سے کچھ زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے، ان سب حدیثوں کے متعلق یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سینکڑوں، ہزاروں سال کی مدت میں ہونے والے واقعات کا بہت ہی مجمل بیان ان میں کیا گیا ہے، جو لوگ اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں گے، انشاء اللہ وہ ان حدیثوں کے بارے میں بہت سے شبہات اور وساوس سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حدیث کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے، کہ فرشتوں کو بتلایا جائے گا، کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنم والے ہیں، دنیا میں مؤمنین اور غیر مؤمنین کا جو تناسب ہے، اور جو اکثر زمانوں میں رہا ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہل جہنم کی یہ تعداد ۱۰۰۰/۹۹۹ مستبعد نہیں معلوم ہوتی، تاہم بعض شارحین نے لکھا ہے، کہ ان ۹۹۹

فی ہزار میں سے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوگی، جو اگرچہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ کے اہل ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے یا شافعین کی سفارش سے آخر میں وہ نجات پا جائیں گے۔ اللّٰھم ان مغفرتك اوسع من ذنوبنا و رحمتك ارجی عندنا من اعمالنا

۸۵) **عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کَیْفَ اَنْعَمُ وَصَاحِبُ الصُّوْرِ قَدْ اِلْتَقَمَہٗ وَ اَصْغٰی سَمْعَہٗ وَحَنٰی جَبْھَتَہٗ یَنْتَظِرُ مَتٰی یُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَا تَاْمُرُنَا؟ قَالَ قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔** (رواہ الترمذی)

ترجمہ ابو سعید خدری سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں کیونکر خوش اور بے غم ہو کر رہ سکتا ہوں، حالانکہ واقعہ یہ ہے، کہ صور والا فرشتہ صور کو اپنے منہ میں لئے ہوئے ہے، اور اپنا کان اسنے لگا رکھا ہے اور اسکی پیشانی خمیدہ اور جھکی ہوئی ہے، وہ انتظار کر رہا ہے کہ کب اس کو صُور کے پھونک دینے کا حکم ہو، اور وہ پھونک دے، (یعنی جب مجھے اس واقعہ کا علم ہے، تو میں کیسے اس دنیا میں اطمینان سے اور خوشی سے رہ سکتا ہوں)" صحابہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! تو ہمیں آپ کا کیا حکم ہے، (ان کا مطلب یہ تھا، کہ جب معاملہ اتنا خطرناک ہے، تو ہماری رہنمائی فرمایئے، کہ قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے بچنے کیلئے ہم کیا کریں؟)" آپ نے ارشاد فرمایا: کہتے رہا کرو "حسبنا اللہ و نعم الوکیل"۔ (ترمذی)

۸۶) **عَنْ اَبِیْ رَزِیْنِ الْعُقَیْلِیْ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ یُعِیْدُ اللّٰہُ الْخَلْقَ وَمَا اٰیَۃُ ذَالِكَ فِیْ خَلْقِہٖ قَالَ اَمَا مَرَرْتَ بِوَادِیْ قَوْمِكَ جَدْ بًاثُمَّ مَرَرْتَ بِہٖ یَھْتَزُّ خَضِرًا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَتِلْكَ اٰیَۃُ اللّٰہِ فِیْ خَلْقِہٖ کَذَالِكَ یُحْیِی اللّٰہُ الْمَوْتٰی۔** (رواہ رزین)

ترجمہ رزین عُقیلی سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے (ایک دفعہ) عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ کیسے پیدا کرے گا، اور (اس عالم میں) اس کی مخلوق میں اس کی کیا نشانی ہے (اور کیا دلیل اور مثال ہے) آپ نے فرمایا: "کیا تمہارے لئے ایسا کبھی نہیں ہوا، کہ تم اپنی قوم کی وادی پر ایسی حالت میں گذرے ہو جبکہ وہ (پانی نہ برسنے کی وجہ سے) سبزے سے خالی اور خشک ہو، اور پھر کبھی ایسی حالت میں گذرے ہو کہ (پانی برس جانے کی وجہ سے) وہ ہری لہلہا رہی ہو۔ (ابو رزین کہتے ہیں) میں نے عرض کیا، ہاں! (ایسا ہوا ہے، اور میں نے یہ دونوں منظر دیکھے ہیں)۔ آپ نے فرمایا "حیات بعد الموت کو سمجھنے کے لئے) یہی اللہ کی نشانی ہے اس کی مخلوق میں، ایسے ہی زندہ کر دے گا اللہ مُردوں کو۔ (رزین)

۸۷) **عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ کَاَنَّہٗ رَاْیُ عَیْنٍ فَلْیَقْرَءْ اِذَاالشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَاِذَاالسَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَاالسَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔** (رواہ احمد و الترمذی)

ترجمہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کی یہ خوشی ہو، یعنی جو یہ چاہے کہ قیامت کا منظر وہ اس طرح دیکھے، کہ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، تو قرآن مجید کی سورۃ اذا الشمس کورت، واذا السماء انفطرت اور اذا السماء انشقت پڑھے۔"

۸۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ هٰذِهِ الْاٰیَةَ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَخْبَارُهَا قَالُوا اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ اَخْبَارَهَا اَنْ تَشْهَدَ عَلٰی کُلِّ عَبْدٍ وَاَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰی ظَهْرِهَا اَنْ تَقُوْلَ عَمِلَ عَلَیَّ کَذَا وَکَذَا یَوْمَ کَذَا وَکَذَا قَالَ فَهٰذِهٖ اَخْبَارُهَا. (رواه احمد والترمذی)

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ زلزال کی یہ آیت تلاوت فرمائی "یومئذ تحدث اخبارها" (جس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن زمین اپنی سب خبریں بیان کرے گی) پھر حاضرین سے فرمایا، کیا تم جانتے ہو، کہ زمین کی خبریں کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا، اللہ اور اسکے رسول ہی کو زیادہ علم ہے، آپ نے فرمایا اسکی خبریں یہ ہیں کہ وہ ہر بندہ اور ہر بندی کے متعلق شہادت دے گی، کہ اسنے فلاں دن میرے اوپر فلاں کام کیا تھا، اور فلاں دن فلاں عمل کیا تھا، پس یہ ہیں زمین کی خبریں (جو قیامت کے دن وہ بیان کرے گی۔) (احمد و ترمذی)

تشریح گویا انسان جو عمل زمین کے جس حصے پر کرتا ہے زمین کا وہ حصہ اس کو محفوظ رکھتا ہے، اور قیامت تک محفوظ رکھے گا، اور اللہ کے سامنے اس کی شہادت ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس دن اس پر اس وقت کی رسوائیوں سے حفاظت فرمائے۔

اس قسم کی چیزوں پر یقین لانا ایمان والوں کے لئے تو پہلے بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن اب توریکارڈو غیرہ کی ایجادوں نے ان باتوں کا سمجھنا، اوران پر یقین کرنا سب کے لئے آسان کردیا ہے۔

صدق الله عزو جل سنريهم اٰياتنا في الافاق و في انفسهم.

۸۹) عَنِ الْمِقْدَادِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَقُوْلُ تُدْنٰی الشَّمْسُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰی تَکُوْنَ مِنْهُمْ کَمِقْدَارِ مِیْلٍ فَیَکُوْنُ النَّاسُ عَلٰی قَدْرِ اَعْمَالِهِمْ فِی الْعَرَقِ فَمِنْهُمْ مَنْ یَّکُوْنُ اِلٰی کَعْبَیْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّکُوْنُ اِلٰی رُکْبَتَیْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّکُوْنُ اِلٰی حِقْوَیْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ یُّلْجِمُهُمُ الْعَرَقُ اِلْجَامًا وَاَشَارَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِیَدِهٖ اِلٰی فِیْهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ حضرت مقداد سے روایت ہے، فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ ارشاد فرماتے تھے، "قیامت کے دن سورج مخلوق سے بہت قریب ہو جائیگا، یہاں تک کہ ان سے صرف ایک میل کے بقدر رہ جائیگا اور (اسکی گرمی سے) لوگ بقدر اپنے اعمال کے پسینہ پسینہ ہو جائیں گے (یعنی جسکے اعمال جتنے برے ہوں گے، اسی قدر اس کو پسینہ زیادہ چھوٹے گا) پس بعض وہ ہوں گے جنکا پسینہ انکے ٹخنوں تک آئیگا اور بعض کا پسینہ انکے گھٹنوں تک ہوگا، اور بعض کا انکے کولھوں کے اوپر تک (یعنی کمر تک) اور بعض وہ ہونگے جن کا پسینہ ان کے منہ میں جارہا ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے دہن مبارک کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے دکھایا (کہ ان کا پسینہ یہاں تک پہنچ رہا ہوگا، اور انکے اس منہ میں جارہا ہوگا)"۔ (مسلم)

تشریح قیامت اور آخرت میں پیش آنے والے ان واقعات کی جو واقعی نوعیت ہوگی اس کا اس دنیا میں صحیح تصور نہیں کیا جا سکتا، پورا انکشاف بس اسی وقت ہوگا، جبکہ یہ حقائق سامنے آئیں گے۔

۹۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُحْشَرُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثَلٰثَةَ اَصْنَافٍ صِنْفًا مُشَاةً وَصِنْفًا رُكْبَانًا وَ صِنْفًا عَلٰی وُجُوْهِهِمْ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَیْفَ یَمْشُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ؟ قَالَ اِنَّ الَّذِیْ اَمْشَاهُمْ عَلٰی اَقْدَامِهِمْ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ یُّمْشِیَهُمْ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اَمَا اِنَّهُمْ یَتَّقُوْنَ بِوُجُوْهِهِمْ كُلَّ حَدْبٍ وَشَوْكٍ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ "قیامت کے دن سب آدمی تین قسموں اور تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے، ایک قسم پیدل چلنے والے، اور ایک قسم سوار، اور ایک قسم منہ کے بل چلنے والے"۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! یہ (تیسرے گروہ والے) منہ کے بل کس طرح چل سکیں گے؟" آپ نے فرمایا: "جس اللہ نے انہیں پاؤں کے بل چلایا ہے، وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ ان کو منہ کے بل چلائے"۔ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ اپنے منہ کے ذریعے ہی زمین کے ہر ٹیلے ٹھیرے، اور ہر کانٹے سے بچیں گے۔ (ترمذی)

تشریح ...... حدیث میں جن تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے شارحینِ حدیث نے ان کی تفصیل اس طرح کی ہے، کہ پیدل چلنے والا گروہ عام اہلِ ایمان کا ہوگا، اور دوسرا گروہ جو سواریوں پر ہوگا، وہ خاص مقربین اور عبادِ صالحین کا گروہ ہوگا، جن کا وہاں شروع ہی سے اعزاز و اکرام ہوگا، اور سر کے بل، اور منہ کے بل چلنے والے وہ بد نصیب ہوں گے، جنہوں نے اس دنیوی زندگی میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق سیدھا چلنا قبول نہیں کیا، اور مرتے دم تک وہ الٹے ہی چلتے رہے۔ قیامت کے دن اس کی پہلی سزا انہیں یہ ملے گی، کہ سیدھے پاؤں پر چلنے کے بجائے وہاں وہ الٹے منہ کے اور سر کے بل چلائے جائیں گے، یہاں تک کہ جس طرح اس دنیا میں چلنے والے راستے کی اونچ نیچ سے، اور جھاڑیوں اور کانٹوں سے اپنے پاؤں کے ذریعہ بچ کر نکلتے ہیں، اسی طرح قیامت میں یہ سر کے بل چلنے والے وہاں کے راستے کی اونچ نیچ سے، اور وہاں کے کانٹوں سے اپنے سروں اور چہروں ہی کے ذریعہ بچ کر نکلیں گے، یعنی یہاں پر جو کام پاؤں سے کئے جاتے ہیں، وہاں وہ سب کام خدا کے ان مجرموں کو سر سے اور منہ سے کرنے پڑیں گے۔ اللّٰھم لا تجعلنا منھم

۹۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ یَّمُوْتُ اِلَّا نَدِمَ قَالُوْا وَمَا نَدَامَتُهُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ اَنْ لَا یَكُوْنُ اِزْدَادَ وَ اِنْ كَانَ مُسِیْئًا نَدِمَ اَنْ لَا یَكُوْنَ نَزَعَ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص بھی مرے گا، اس کو (مرنے کے بعد اپنی زندگی پر) ندامت اور پشیمانی ضرور ہوگی"۔ عرض کیا گیا کہ: حضرت! اس کو ندامت کیوں ہوگی؟ اور اس کا کیا سبب ہوگا؟ آپ نے فرمایا، اگر وہ مرنے والا نیکوکار ہوگا، تو اس کو تو اس کی ندامت اور حسرت ہوگی، کہ اس نے نیکوکاری میں اور زیادہ ترقی کیوں نہیں کی (اور جو حسنات وہ کما کے لایا ہے اس سے زیادہ کیوں نہیں کما کے لایا) اور اگر وہ بدکار ہوگا، تو اس کو اس کی ندامت و حسرت ہوگی، کہ وہ بدکاری سے باز کیوں نہیں رہا۔" (ترمذی)

اللہ کے حضور میں پیشی اور اعمال کی جانچ

۹۲) عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَیُکَلِّمُهٗ رَبُّهٗ لَیْسَ بَیْنَهٗ وَبَیْنَهٗ تَرْجُمَانٌ وَلَا حِجَابٌ یَحْجُبُهٗ فَیَنْظُرُ اَیْمَنَ مِنْهُ فَلَا یَرٰی اِلَّا مَا قَدَّمَ مِنْ عَمَلِهٖ وَیَنْظُرُ اَشْاَمَ مِنْهُ فَلَا یَرٰی اِلَّا مَا قَدَّمَ وَیَنْظُرُ بَیْنَ یَدَیْهِ فَلَا یَرٰی اِلَّا النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔

عدی بن حاتم سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”(قیامت میں) تم میں سے ہر شخص سے اس کا پروردگار اس طرح بلا واسطہ اور دو بدو کلام فرمائے گا، کہ نہ درمیان میں کوئی ترجمان ہوگا، نہ کوئی پردہ حائل ہوگا (اس وقت بندہ کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ حیرت اور بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھے گا)۔ پس جب نظر کرے گا اپنی داہنی جانب، تو سوائے اپنے اعمال کے کچھ اس کو نظر نہ آئے گا، اور ایسے ہی جب نظر آئیگا بائیں جانب تو سوائے اپنے اعمال کے کچھ اسے نظر نہ آئیگا۔ اور جب سامنے نظر دوڑائے گا، تو اپنے روبرو آگ ہی آگ دیکھے گا، پس اے لوگو! دوزخ کی اس آگ سے بچو، اگرچہ خشک کھجور کے ایک خشک ٹکڑے ہی کے ذریعہ اس سے بچنے کی فکر کرو“۔

تشریح ... مطلب یہ ہے کہ آتش دوزخ سے بچنے کے لئے صدقہ کرو، اور اگر کھجور کے ایک خشک ٹکڑے کے سوا تمہیں کچھ میسر نہ ہو تو راہ خدا میں وہی دے کے دوزخ سے بچنے کی فکر کرو۔

فائدہ..... قرآن مجید میں اور احادیث میں بھی جہاں جہاں قیامت کے حساب اور وہاں کے ہولناک منظروں کا اور دوزخ کے لرزہ خیز عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس لئے ہے کہ بندے اس سے خبردار ہو کر اپنے کو اس سے بچانے کی فکر کریں، اس حدیث میں تو آخر میں صراحت کے ساتھ اس مقصد کو بیان بھی فرمادیا گیا ہے لیکن جن حدیثوں میں اس مقصد کی تصریح نہ بھی کی گئی ہو، ان کا مقصد بھی یہی سمجھنا چاہئے، اور اس سلسلہ کی تمام آیات واحادیث سے ہم کو یہی سبق لینا چاہئے۔

۹۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ هَلْ نَرٰی رَبَّنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؟ قَالَ هَلْ تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ الشَّمْسِ فِی الظَّهِیْرَةِ لَیْسَتْ فِیْ سَحَابَةٍ قَالُوْا لَا قَالَ فَهَلْ تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ لَیْسَ فِیْ سَحَابَةٍ قَالُوْا لَا قَالَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ رَبِّکُمْ اِلَّا کَمَا تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ اَحَدِهِمَا قَالَ فَیَلْقَی الْعَبْدَ فَیَقُوْلُ اَیْ فُلْ اَلَمْ اُکْرِمْكَ وَاُسَوِّدْكَ وَ اُزَوِّجْكَ وَاُسَخِّرْ لَكَ الْخَیْلَ وَالْاِبِلَ وَاَذَرْكَ تَرْاَسُ وَتَرْبَعُ فَیَقُوْلُ بَلٰی قَالَ فَیَقُوْلُ اَفَظَنَنْتَ اَنَّكَ مُلَاقِیَّ فَیَقُوْلُ لَا فَیَقُوْلُ فَاِنِّیْ قَدْ اَنْسَاكَ کَمَا نَسِیْتَنِیْ ثُمَّ یَلْقَی الثَّانِیْ فَذَکَرَ مِثْلَهٗ ثُمَّ یَلْقَی الثَّالِثَ فَیَقُوْلُ لَهٗ مِثْلَ ذَالِكَ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اٰمَنْتُ بِكَ وَبِکِتَابِكَ وَبِرُسُلِكَ وَصَلَّیْتُ وَصُمْتُ وَ تَصَدَّقْتُ وَیُثْنِیْ بِخَیْرٍ مَا اسْتَطَاعَ فَیَقُوْلُ هٰهُنَا اِذًا، ثُمَّ یُقَالُ اَلْاٰنَ نَبْعَثُ شَاهِدًا عَلَیْكَ وَیَتَفَکَّرُ فِیْ نَفْسِهٖ مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْهَدُ عَلَیَّ فَیُخْتَمُ عَلٰی فِیْهِ وَیُقَالُ لِفَخِذِهٖ اِنْطِقِیْ فَتَنْطِقُ فَخِذُهٗ وَلَحْمُهٗ وَ عِظَامُهٗ بِعَمَلِهٖ وَذَالِكَ لِیُعْذِرَ مِنْ نَفْسِهٖ وَذَالِكَ الْمُنَافِقُ وَ ذَالِكَ

الَّذِیْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْہِ.　　(رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں، کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟" آپ نے فرمایا "کیا دوپہر کے وقت میں آفتاب کے دیکھنے میں، جبکہ وہ بدلی میں بھی نہ ہو، تم میں کوئی کشمکش ہوتی ہے؟" انہوں نے عرض کیا، "نہیں!" پھر آپ نے فرمایا: "کیا چودھویں رات کے چاند کے دیکھنے میں، جبکہ وہ بدلی میں بھی نہ ہو، تم میں کوئی کشمکش اور کوئی ردوکد ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا "نہیں!" اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جس طرح چاند اور سورج کو بلا کسی کشمکش اور بغیر کسی اختلاف اور نزاع کے دیکھتے ہو، اسی طرح قیامت میں اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ قیامت میں جب اللہ سے ایک بندہ کا سامنا ہو گا، تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، اے فلانے کیا میں نے دنیا میں تجھے عزت نہیں دی تھی، کیا تجھے تیری قوم میں سرداری نہیں دی تھی، کیا تجھے بیوی نہیں عطا کی تھی، اور کیا تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ (سواریوں) کو مسخر نہیں کیا تھا، اور کیا میں نے تجھے چھوڑے نہیں رکھا تھا، کہ تو ریاست اور سرداری کرے، اور مالِ غنیمت میں سے چوتھائی وصول کرے، وہ بندہ عرض کرے گا، ہاں! اے پروردگار آپ نے یہ سب کچھ مجھے عطا فرمایا تھا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، تو کیا تجھے اس کا خیال اور گمان تھا، کہ تو ایک دن میرے سامنے آئے گا؟ وہ عرض کرے گا، میں یہ خیال نہیں کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آج میں تجھے اپنے رحم و کرم سے اسی طرح بھلاتا ہوں، جس طرح تو نے مجھے بھلائے رکھا تھا۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ سے دوسرے ایک بندہ کا سامنا ہو گا، اور اس سے بھی حق تعالیٰ اسی طرح فرمائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ تیسرے ایک بندہ سے ملے گا، اور اس سے بھی اسی طرح فرمائے گا، یہ بندہ عرض کرے گا، کہ اے پروردگار میں تجھ پر ایمان لایا، اور تیری کتاب پر، اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا، اور میں نے نمازیں پڑھیں، اور روزے رکھے، اور صدقہ بھی ادا کیا (اور اس کے علاوہ بھی) وہ بندہ خوب اپنے اچھے کارنامے بیان کرے گا، جہاں تک بھی بیان کر سکے گا، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہاں ٹھہر! پھر اس سے کہا جائے گا، کہ ہم ابھی تجھ پر ایک گواہ قائم کرتے ہیں، اور وہ اپنے جی میں سوچے گا، کہ وہ کون ہو گا جو مجھ پر گواہی دے گا، پھر اسکے منہ پر مہر لگادی جائے گی اس کی ران کو حکم دیا جائے گا، کہ بول! تو اس کی ران اور اس کا گوشت، اور اسکی ہڈیاں اُس کے اعمال کی گواہی دیں گے، اور اللہ تعالیٰ یہ اسلئے کرے گا، کہ اس کا عذر باقی نہ رہے، اور یہ منافق ہو گا، اور اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو گا۔　　(مسلم)

تشریح...... پوچھنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے صرف اتنا پوچھا تھا، کہ کیا قیامت میں ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں گے؟ آپ نے چاند اور سورج کی مثال دے کر یہ سمجھا دینا چاہا، کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیکھنا اتنے واضح طریقے پر ہو گا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو گی، نیز یہ بھی آپ نے واضح فرمایا، کہ جس طرح چاند اور سورج کو مشرق و مغرب کے کروڑوں آدمی بیک وقت دیکھتے ہیں، اور بالکل یکساں طور پر دیکھتے

ہیں، اور انکے درمیان کوئی کشمکش نہیں ہوتی، اسی طرح قیامت میں سب اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھ سکیں گے۔ پھر مزید بر آں آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بڑی بڑی نعمتیں دے رکھی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کو بالکل بھولے ہوئے ہیں، اور آخرت کی پیشی سے بالکل بے فکر ہو گئے ہیں، جب قیامت میں اللہ تعالیٰ سے انکا سامنا ہو گا، اور اللہ تعالیٰ ان سے باز پرس کرے گا، تو اس دن وہ کیسے لاجواب، اور کیسے ذلیل و خوار ہوں گے، اور ان میں سے جو دیدہ ور اور بے حیا منافق اس وقت غلط بیانی کریں گے، اللہ تعالیٰ خود انہیں کے اعضاء سے اور انہیں کے گوشت، اور انہیں کی ہڈیوں سے ان کے خلاف گواہی دلوا کر ان پر حجت قائم فرمادیں گے، اور اس طرح علی رؤس الاشہاد ان کے جھوٹ، اور ان کی منافقت کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے اصل سوال سے زائد یہ بیان، سوال کرنے والے صحابہ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے فرمایا، کہ قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ہی نہ ہو گا بلکہ حق تعالیٰ نے جو نعمتیں جس کو دی ہیں اس وقت وہ ان کی بابت پوچھ گچھ بھی کرے گا۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ اور جن لوگوں نے اللہ کے احکام سے بے پرواہو کر اور آخرت کی پیشی سے بے فکر رہ کر ان نعمتوں کو دنیا میں استعمال کیا ہو گا، وہ اس دن سیاہ ہوں گے، اور وہاں کسی کی مکاری اور عیاری بالکل پردہ پوشی نہ کر سکے گی۔

۹۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ اللهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهُ وَيَسْتُرُهُ فَيَقُوْلُ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا فَيَقُوْلُ نَعَمْ اَىْ رَبِّ! حَتّٰى قَرَّرَهُ بِذُنُوْبِهِ وَرَأَى فِيْ نَفْسِهِ اَنَّهُ قَدْ هَلَكَ قَالَ سَتَرْتُهَا لَكَ فِي الدُّنْيَا وَاَنَا اَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطٰى كِتَابَ حَسَنَاتِهِ وَاَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيُنَادٰى بِهِمْ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہتے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت میں اللہ تعالیٰ ایمان والے اپنے بندے کو (اپنی رحمت سے) قریب کرے گا، اور اس پر اپنا خاص پردہ ڈالے گا، اور دوسروں سے اس کو پردہ میں کرلے گا، پھر اس سے پوچھے گا، کہ کیا تو پہچانتا ہے فلاں گناہ، فلاں گناہ! (یعنی کیا تجھے یاد ہے، کہ تو نے یہ یہ گناہ کئے تھے؟) وہ عرض کرے گا ہاں! اے پروردگار! مجھے یاد ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسکے سارے گناہوں کا اس سے اقرار کرالے گا، اور وہ اپنے جی میں خیال کرے گا کہ میں تو ہلاک ہوا (یعنی اس کو خیال ہو گا، کہ جب اتنے میرے گناہ ہیں، تو اب میں کیسے چھٹکارا پاسکوں گا) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں کو چھپایا تھا، اور آج میں ان کو بخشتا ہوں اور معافی دیتا ہوں، پھر اس کا نیکیوں والا اعمال نامہ اسکے حوالے کر دیا جائے گا (یعنی اہل محشر کے سامنے صرف نیکیوں والا ہی اعمال نامہ آئے گا، اور گناہوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پردہ ہی پردہ میں ختم کر دیں گے) لیکن اہل کفر اور منافقین کا معاملہ یہ ہو گا، کہ ان کے متعلق برسر عام پکارا جائے گا، کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اللہ پر جھوٹی باتیں باندھیں (یعنی غلط اور بے اصل خیالات کو اللہ کی طرف نسبت دے کر اپنا دین و مذہب بنایا) خبردار اللہ کی لعنت ہے ایسے ظالموں پر۔

۹۵) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا ذَكَرَتِ النَّارَ فَبَكَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا يُبْكِيْكِ قَالَتْ ذَكَرْتُ النَّارَ فَبَكَيْتُ فَهَلْ تَذْكُرُوْنَ اَهْلِيْكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَمَّا فِىْ ثَلٰثَةِ مَوَاطِنَ فَلَا يَذْكُرُ اَحَدٌ اَحَدًا عِنْدَ الْمِيْزَانِ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيَخِفُّ مِيْزَانُهٗ اَمْ يَثْقُلُ وَعِنْدَ الْكِتَابِ حِيْنَ يُقَالُ هَآؤُمُ اقْرَءُ وْا كِتَابِيَهْ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيْنَ يَقَعُ كِتَابُهٗ فِىْ يَمِيْنِهٖ اَمْ فِىْ شِمَالِهٖ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ وَعِنْدَ الصِّرَاطِ اِذَا وُضِعَ بَيْنَ ظَهْرَىْ جَهَنَّمَ۔ (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ انہیں ایک دفعہ دوزخ کا خیال آیا، اور وہ رونے لگیں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، تمہیں کس چیز نے رلایا؟ عرض کیا، مجھے دوزخ یاد آئی، اور اسی کے خوف نے مجھے رلایا ہے، تو کیا آپ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تین جگہ تو کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا (اور کسی کی خبر نہیں لے گا) ایک وزن اعمال کے وقت، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے، کہ اسکے اعمال کا وزن ہلکا ہے یا بھاری، اور دوسرے اعمالناموں کے ملنے کے وقت جبکہ مرد مؤمن داہنے ہاتھ میں اپنا اعمال نامہ پاکر خوشی خوشی دوسرے سے کہے گا، کہ پڑھو میرا اعمال نامہ، یہاں تک کہ معلوم ہو جائے، کہ کس ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کا اعمال نامہ، آیا داہنے ہاتھ میں، یا پیچھے کی جانب سے بائیں ہاتھ میں، اور تیسرے پُل صراط پر جبکہ وہ رکھا جائے گا، جہنم کے اوپر (اور حکم دیا جائے گا سب کو اس پر سے گزرنے کا)۔ (ابو داؤد)

تشریح......رسول اللہ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تین وقت ایسے نفسا نفسی کے ہوں گے کہ ہر ایک کو صرف اپنی فکر ہو گی، اور کوئی کسی دوسرے کی مدد نہ کر سکے گا، ایک وزن اعمال کا وقت، جب تک کہ نتیجہ معلوم نہ ہو جائے گا، اور دوسرا وہ وقت جب لوگ اپنے اپنے اعمال ناموں کے منتظر ہوں گے، اور ہر ایک اس فکر میں غرق ہو گا، کہ اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جاتا ہے یا بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے، وہ مغفرت اور رحمت کا مستحق قرار پاتا ہے، یا لعنت اور عذاب کا، اور تیسرے اس وقت، جبکہ صراط کا پل جہنم پر لگا دیا جائے گا اور اس پر سے گزرنے کا حکم ہو گا، تو یہ تین وقت ایسے نفسا نفسی کے ہوں گے کہ ہر ایک اپنی ہی فکر میں ڈوبا ہو گا، اور کوئی کسی کی خبر نہ لے سکے گا۔

اس حدیث کی روح اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا منشاء بس یہی ہے، کہ ہر شخص آخرت کی فکر کرے، اور کوئی کسی دوسرے کے بھروسہ نہ رہے۔

قیامت میں حقوق العباد کا انصاف

۹۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَ رَجُلٌ فَقَعَدَ بَيْنَ يَدَىْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنَّ لِىْ مَمْلُوْكِيْنَ يُكَذِّبُوْنَنِىْ وَيَخُوْنُوْنَنِىْ وَ يَعْصُوْنَنِىْ وَ اَشْتِمُهُمْ وَاَضْرِبُهُمْ فَكَيْفَ اَنَا مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُحْسَبُ مَا خَانُوْكَ وَعَصَوْكَ وَ كَذَّبُوْكَ وَعِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ بِقَدْرِ ذُنُوْبِهِمْ كَانَ كَفَافًا لَالَكَ وَلَا عَلَيْكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ

دُوْنَ ذَنْبِهِمْ كَانَ فَضْلًا لَكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَوْقَ ذُنُوْبِهِمْ اُقْتُصَّ لَهُمْ مِنْكَ الْفَضْلُ فَتَنَحَّى الرَّجُلُ وَجَعَلَ يَهْتِفُ وَيَبْكِيْ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تَقْرَءُ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ، فَقَالَ الرَّجُلُ مَا اَجِدُلِيْ وَلِهٰؤُلَاءِ شَيْئًا خَيْرًا مِنْ مُفَارَقَتِهِمْ اُشْهِدُكَ اَنَّهُمْ كُلُّهُمْ اَحْرَارٌ. (رواه الترمذی)

ترجمہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا، پھر عرض کیا، یارسول اللہ! میرے پاس کچھ غلام ہیں (جن کی حالت یہ ہے کہ بسااوقات وہ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، میری چیزوں میں خیانتیں بھی کرتے ہیں، میری نافرمانی بھی کرتے ہیں، اور میں (ان کی ان حرکتوں پر) کبھی انہیں گالیاں دیتا ہوں اور کبھی مارتا بھی ہوں، پس کیا حال ہوگا میرا قیامت کے دن ان کی وجہ سے (یعنی اللہ تعالیٰ میرا اور ان کا فیصلہ کس طرح فرمائے گا) رسول اللہ ﷺ نے اسکے جواب میں فرمایا: کہ "تمہارے ان غلاموں نے تمہاری جو خیانت اور نافرمانی کی ہوگی، اور تم سے جو جو جھوٹ بولے ہوں گے، اور پھر تم نے ان کو جو سزائیں دی ہونگی، قیامت کے دن ان سب کا پورا پورا حساب کیا جائے گا، پس اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں کے بقدر ہی ہوگی تو معاملہ برابر پر ختم ہو جائے گا، نہ تم کو کچھ ملے گا اور نہ تمہیں کچھ دینا پڑے گا، اور اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں سے کم ثابت ہوگی تو تمہارا فاضل حق تمہیں وہاں ملے گا، اور اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں سے زیادہ ثابت ہوگی، تو تم سے اس کا بدلہ اور قصاص انکو دلوایا جائے گا (جب اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کا یہ جواب سنا) تو آپ کے پاس سے ایک طرف کو ہٹکر رونے اور چلانے لگا (یعنی قیامت کے اس محاسبہ اور پھر وہاں کے عذاب کے خوف سے جب اس پر گریہ غالب ہوا تو وہ ادب کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے اٹھ گیا، اور ایک طرف کو ہٹ کر بے اختیار رونے اور چلانے لگا)۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر اس سے فرمایا، کیا تم قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھتے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ ○

اور ہم قائم کرینگے قیامت کے دن انصاف کی میزانیں، پس نہیں ظلم ہوگا، کسی نفس پر کچھ بھی، اور اگر ہوگا کسی کا عمل، یا حق، رائی کے ایک دانے کے برابر حاضر کرینگے ہم اُس کو بھی، اور کافی ہیں ہم حساب کرنیوالے۔ اس شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ! (یہ سب کچھ سننے کے بعد) میں اپنے لئے اور ان کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں سمجھتا، کہ (لوجہ اللہ آزاد کر کے) ان کو اپنے سے الگ کردوں، میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے ان کو آزاد کر دیا اور اب وہ آزاد ہیں۔

تشریح ..... ایمان کی یہی شان ہے، اور سچے ایمان والوں کا طرزِ عمل یہی ہونا چاہئے کہ جس چیز میں آخرت کا خطرہ نظر آئے اس سے بچا جائے، اگرچہ دنیوی نقطۂ نظر سے اس میں اپنا کتنا ہی نقصان ہو۔

میزانِ اعمال میں اللہ کے نام کا وزن

[illegible] عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ سَيُخَلِّصُ رَجُلًا مِنْ اُمَّتِيْ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيَنْشُرُ عَلَيْهِ تِسْعَةً وَ تِسْعِيْنَ سِجِلًّا كُلُّ سِجِلٍّ مِثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَتُنْكِرُ مِنْ هٰذَا شَيْئًا اَظَلَمَكَ كَتَبَتِي الْحٰفِظُوْنَ فَيَقُوْلُ لَا يَا رَبِّ فَيَقُوْلُ اَفَلَكَ عُذْرٌ قَالَ لَا يَارَبِّ فَيَقُوْلُ بَلٰى اِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ لَا ظُلْمَ عَلَيْكَ الْيَوْمَ فَتَخْرُجُ بِطَاقَةٌ فِيْهَا اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَيَقُوْلُ اُحْضُرْ وَزْنَكَ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ مَا هٰذِهِ الْبِطَاقَةُ مَعَ هٰذِهِ السِّجِلَّاتِ فَيَقُوْلُ اِنَّكَ لَا تُظْلَمُ قَالَ فَتُوْضَعُ السِّجِلَّاتُ فِيْ كِفَّةٍ وَالْبِطَاقَةُ فِيْ كِفَّةٍ فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ فَلَا يَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللّٰهِ شَيْءٌ۔ [illegible]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری اُمت میں سے ایک شخص کو ساری مخلوق کے روبرو الگ نکالے گا، اور اسکے سامنے ننانوے دفتر کھولے جائیں گے، جن میں ہر دفتر کی لمبائی گویا حد نظر تک ہوگی، (یہ دفتر اسکے اعمال نامے ہوں گے) پھر اس سے فرمایا جائے گا، کہ (تیرے جو اعمال ان دفتروں میں لکھے ہوئے ہیں) کیا ان میں سے کسی کا تجھے انکار ہے؟ کیا تیرے اعمال کی نگرانی کرنے والے، اور لکھنے والے میرے فرشتوں نے تجھ پر ظلم کیا ہے (اور غلط طور پر کوئی گناہ تیرے اعمال نامے میں لکھ دیا ہے)۔ وہ عرض کرے گا نہیں پروردگار! (مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا ہے، بلکہ یہ سب میرے کئے ہوئے اعمال ہیں)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے، وہ عرض کرے گا، خداوندا میرے پاس کوئی عذر بھی نہیں (یہاں تک کہ سوال و جواب سے خود اس شخص کو اور دوسرے لوگوں کو بھی خیال ہوگا کہ یہ بندہ اب گرفت اور عذاب سے کہاں بچ سکے گا، لیکن ارحم الراحمین کی رحمت کا اس طرح ظہور ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ اس شخص سے فرمائیں گے، ہاں! ہمارے پاس تیری ایک خاص نیکی بھی ہے، اور آج تیرے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوگا (اور اسُ نیکی کے فائدہ سے تجھے محروم نہیں کیا جائے گا)۔ یہ فرما کر کاغذ کا ایک پرزہ نکالا جائے گا۔ اس میں لکھا ہوگا اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ اور اس بندے سے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال کے وزن کے پاس حاضر ہو (یعنی چل کر اپنے سامنے وزن کرا) وہ عرض کرے گا، خداوندا! ان دفتروں کے سامنے اس پرزہ کی کیا حقیقت ہے، اور ان سے اس کو کیا نسبت ہے (یعنی میں وہاں جا کر کیا دیکھوں گا، اور کیا کروں گا، نتیجہ تو معلوم ہی ہے، کہاں اتنے بڑے بڑے ننانوے دفتر، اور کہاں یہ ذرا سا پرزہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا، نہیں تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا (بلکہ پورا پورا انصاف کیا جائے گا، جس پرزہ کو تو معمولی اور بے وزن سمجھ رہا ہے تیرے سامنے اس کا بھی وزن کیا جائے گا اور آج اس کا، اور اس میں لکھے ہوئے ایمانی کلمہ کا وزن ظاہر ہوگا اور اسکا تجھے پورا پورا فائدہ پہنچایا جائے گا، اسلئے مایوس نہ ہو، اور میزان کے پاس جا کر وزن کو دیکھ) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے، اور کاغذ کا وہ پرزہ دوسرے پلڑے میں، پس ہلکے ثابت ہوں گے وہ دفتر اور بھاری رہے

گا وہ پرزہ، اور کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی، اللہ کے نام کے مقابلے میں۔

تشریح بعض شارحین نے اس حدیث کی توجیہ میں لکھا ہے کہ یہ شہادت کا وہ کلمہ ہوگا جو کفر و شرک سے نکلنے کے لئے اور ایمان واسلام میں آنے کے لئے پہلی دفعہ دل وزبان سے پڑھا گیا ہوگا، قیامت میں وزن اعمال کے وقت اس کا یہ اثر ظاہر ہوگا کہ ساری عمر کے پہلے گناہ اس کے اثر سے بے وزن اور بے اثر ہو جائیں گے پہلے بھی ایک حدیث گذر چکی ہے: "ان الاسلام يهدم ما كان قبله" (یعنی اسلام قبول کرنے سے وہ سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں جو پہلی زندگی میں آدمی نے کئے ہوں)۔

اور ایک دوسری توجیہ اس حدیث کی یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ معاملہ اس شخص کا ہوگا جو مدت دراز تک غفلت اور بے پروائی سے گناہ پر گناہ کرتا رہا اور دفتر کے دفتر لکھے جاتے رہے، پھر اللہ نے اسے توفیق دی اور اپنے دل کی گہرائی سے اور پورے اخلاص سے اس کلمۂ شہادت اور کلمۂ ایمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنی ایمانی نسبت کو درست کر لیا، اور اسی پر اس کو موت آ گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آسان حساب

۹۸) **عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ فِيْ بَعْضِ صَلَوَاتِهِ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللهِ مَا الْحِسَابُ الْيَسِيْرُ قَالَ اَنْ يُّنْظَرَ فِيْ كِتَابِهٖ فَيُتَجَاوَزَ عَنْهُ اِنَّهٗ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَئِذٍ يَاعَائِشَةُ هَلَكَ.** (رواه احمد)

ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ میں نے بعض نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا (اے اللہ! میرا حساب آسان فرما)

میں نے عرض کیا "حضرت! آسان حساب کا کیا مطلب ہے؟" آپ نے فرمایا: "آسان حساب یہ ہے کہ بندہ کے اعمال نامہ پر نظر ڈالی جائے اور اس سے درگذر کی جائے (یعنی کوئی پوچھ گچھ، اور جرح نہ کی جائے) بات یہ ہے کہ جس کے حساب میں اس دن جرح کی جائے گی، اے عائشہ (اس کی خیر نہیں) وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ایمان والوں کیلئے قیامت کا دن کیسا ہلکا اور مختصر ہوگا

۹۹) **عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيْ اَنَّهٗ اَتٰى رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَ اَخْبِرْنِيْ مَنْ يَّقْوٰى عَلَى الْقِيَامِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْ قَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ " يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ" فَقَالَ يُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَكُوْنَ عَلَيْهِ كَالصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ.** (رواه البيهقي في البعث والنشور)

ترجمہ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "مجھے بتائیے کہ قیامت کے دن جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ: اس دن لوگ کھڑے ہوں گے رب العالمین کے حضور میں، تو اس دن کس کو کھڑے رہنے کی طاقت اور قدرت ہوگی (اور کون اس پورے دن کھڑا رہ

سکے گا جس کے متعلق قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ (وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "سچے ایمان والوں کے حق میں یہ کھڑا ہونا بہت ہلکا اور خفیف کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کیلئے بس ایک فرض نماز کی طرح ہو جائے گا۔　([illegible])

تشریح...... رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ابو سعید خدری کو جو جواب دیا اس کا اشارہ قرآن میں بھی موجود ہے سورۂ مدثر میں فرمایا گیا ہے کہ:

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝

توجب صور پھونک دیا جائے گا تو وہ دن بڑا سخت ہوگا ایمان نہ لانے والوں کیلئے آسان نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سخت اور بھاری دن ایمان والوں کے حق میں سخت اور بھاری نہ ہوگا بلکہ آسان اور ہلکا کر دیا جائے گا۔

راتوں کو اللہ کیلئے جاگنے والوں کا جنت میں بے حساب داخلہ

۱۰۰) **عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يُحْشَرُ النَّاسُ فِىْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُنَادِىْ مُنَادٍ فَيَقُوْلُ اَيْنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ فَيَقُوْمُوْنَ وَهُمْ قَلِيْلٌ فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ ثُمَّ يُؤْمَرُ سَائِرُ النَّاسِ اِلَى الْحِسَابِ.** (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ اسماءؓ بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت کے دن سب لوگ (زندہ کئے جانے کے بعد) ایک وسیع اور ہموار میدان میں جمع کئے جائیں گے (یعنی سب میدانِ حشر میں جمع ہو جائینگے)" پھر اللہ کا منادی پکارے گا، کہ کہاں ہیں وہ بندے جن کے پہلو راتوں کو بستروں سے الگ رہتے تھے (یعنی اپنے بستر چھوڑ کر جو راتوں کو تہجد پڑھتے تھے) پس وہ اس پکار پر کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کی تعداد زیادہ نہ ہوگی، پھر وہ اللہ کے حکم سے بغیر حساب کتاب کے جنت میں چلے جائیں گے اس کے بعد باقی تمام لوگوں کے لئے حکم ہوگا کہ وہ حساب کے لئے حاضر ہوں۔　([illegible])

اُمت محمدیہ ﷺ کی بہت بڑی تعداد کا حساب کے بغیر جنت میں داخلہ

۱۰۱) **عَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ وَعَدَنِىْ رَبِّىْ اَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِىْ سَبْعِيْنَ اَلْفًا لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ وَلَا عَذَابَ مَعَ كُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا وَثُلٰثُ حَثَيَاتٍ مِنْ حَثَيَاتِ رَبِّىْ.** (رواه احمد والترمذى، وابن ماجه)

ترجمہ حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ "میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار کو وہ بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے گا، اور ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہی ہزار اور ہوں گے۔ اور تین حثیے اور میرے پروردگار کے حثیات میں سے (میری امت میں سے بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے جائیں گے)"

تشریح ...... جب دونوں ہاتھ بھر کر کسی کو کوئی چیز دی جائے، تو عربی میں اس کو حثیہ کہتے ہیں جس کو اردو اور ہندی میں لپ بھر کے دینا کہتے ہیں، تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے ستر ہزار کو بلا حساب اور بلا عذاب جنت میں داخل کرے گا، اور پھر ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہی اور اسی طرح بلا حساب و عذاب جنت میں جائیں گے۔ اور اس سب کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص شانِ رحمت سے اس امت کی بہت بڑی تعداد کو تین دفعہ کرکے اور جنت میں بھیجے گا، اور یہ سب وہی ہونگے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہونگے۔

سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

انتباہ ...... اس قسم کی حدیثوں کی پوری حقیقت اسی وقت کھلے گی، جب یہ سب باتیں عملی طور پر سامنے آئیں گی، اس دنیا میں تو ہمارا علم وادراک اتنا ناقص ہے کہ بہت سے ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے سے بھی ہم قاصر رہتے ہیں، جن کی خبریں ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں، مگر اس قسم کے واقعات کا بھی ہم نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہوا نہیں ہوتا۔ صَدَقَ رَبُّنَا عَزَّ وَجَلَّ "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝"

حوضِ کوثر، صراط اور میزان

حدیثوں میں آخرت کی جن چیزوں کا نام ﷺ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ان میں سے یہ تین چیزیں بھی ہیں، ایک حوضِ کوثر، دوسری صراط، اور تیسری میزان۔

پھر کوثر کو بعض احادیث میں حوض کے لفظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے اور بعض میں نہر کے لفظ سے۔ پھر بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوثر جنت کے اندر واقع ہے، اور اکثر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محلِ وقوع جنت سے باہر ہے اور اہلِ ایمان جنت میں جانے سے پہلے اس حوض پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں باریاب ہوکر آپ کے دستِ کرم سے اس کا نہایت سفید و شفاف اور بے انتہا لذیذ و شیریں پانی نوش جان کرینگے، اور تحقیق یہ ہے کہ کوثر کا اصل مرکزی چشمہ جنت کے اندر ہے، اور جنت کے طول و عرض میں اس کی شاخیں نہروں کی شکل میں ہر طرف جاری ہیں۔ اور جس کو حوضِ کوثر کہا جاتا ہے وہ سینکڑوں میل کے طول و عرض میں ایک نہایت حسین و جمیل تالاب ہے جو جنت سے باہر ہے لیکن اس کا تعلق اسی جنت کے اندر کے چشمہ سے ہے، گویا اس میں جو پانی ہوگا وہ جنت ہی کے اس چشمہ سے نہروں کے ذریعہ آئے گا۔ آج کل کے متمدن شہروں میں واٹر ورکس جو نظام ہے اسنے کوثر کی اس نوعیت کا سمجھنا الحمد للہ سب کے لئے آسان کردیا ہے۔

یہاں ایک چیز بھی قابلِ لحاظ ہے کہ حوض کے لفظ سے عموماً لوگوں کا ذہن اسی قسم کے حوضوں کی طرف جاتا ہے جس قسم کے حوض انہوں نے عموماً دنیا میں دیکھے ہوتے ہیں، لیکن حوض کوثر اپنی معنوی کیفیات اور اپنی خوش منظری میں تو دنیا کے حوضوں سے اتنا ممتاز اور فائق ہوگا ہی جتنا کہ جنت کی کسی چیز کو دنیا کی چیزوں کے مقابلے میں ہونا چاہئے، مگر اسکے علاوہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رقبہ اور علاقہ

بھی اتنا ہو گا، کہ ایک راہرو اسکے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کی مسافت ایک مہینے میں طے کر سکے گا اور ایک حدیث میں اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کا فاصلہ عدن اور عمان کے فاصلے کے برابر بتلایا گیا ہے۔

بہر حال آخرت کی چیزوں کے متعلق احادیث میں جو کچھ ذکر کیا جاتا ہے اسکی روشنی میں بھی ان چیزوں کا صحیح تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا، ان چیزوں کی جو واقعی نوعیت اور صورت ہے وہ صحیح طور پر تو سامنے آنے کے بعد ہی معلوم ہو گی۔

یہی بات صراط اور میزان وغیرہ کے بارے میں بھی ملحوظ رہنی چاہئے۔

۱۰۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا اَسِيْرُ فِي الْجَنَّةِ اِذَا اَنَا بِنَهْرٍ حَافَتَاهُ قُبَابُ الدُّرِّ الْمُجَوَّفِ قُلْتُ مَا هٰذَا يَا جِبْرَئِيْلُ؟ قَالَ هٰذَا لْكَوْثَرُ الَّذِىْ اَعْطَاكَ رَبُّكَ فَاِذَا طِيْنُهٗ مِسْكٌ اَذْفَرُ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: انس سے روایت ہے کہتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس اثنا میں کہ میں جنت میں چلا جا رہا تھا، میرا گذر ایک (عجیب و غریب) نہر پر ہوا، اسکے دونوں جانب "درِ مجوف" سے (یعنی اندر سے خالی کئے ہوئے موتیوں سے) تیار کئے ہوئے قبے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جبرئیل نے بتلایا، کہ یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطا فرمایا ہے، میں نے دیکھا کہ اس کی مٹی (جو اسکی تہہ میں تھی) وہ نہایت مہکنے والے مشک کی طرح خوشبودار تھی۔ (بخاری)

تشریح..... اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جنت میں سیر کرتے ہوئے نہر کوثر پر گذرنے کا جو واقعہ ذکر فرمایا ہے، غالباً یہ شب معراج کا ہے، اور حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے جو یہ فرمایا کہ "یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطا کیا ہے"۔ تو یہ قرآن مجید کی آیت "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" کیطرف اشارہ ہے، اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے آپ کو کوثر دیا" کوثر کے اصل معنی خیر کثیر کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خیر کے جو خزانے عطا فرمائے، مثلاً قرآن و شریعت اور اعلیٰ روحانی صفات، اور دنیا اور آخرت میں آپ کی رفعت شان وغیرہ، سو یہ سب بھی کوثر کے عموم میں اگرچہ داخل ہیں، لیکن جنت کی یہ نہر اور اس سے متعلق وہ حوض جو میدان حشر میں ہو گا (جس سے اللہ کے بے شمار بندے سیراب ہوں گے) لفظ کوثر کا خاص مصداق ہیں، یا یوں سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین وایمان کے سلسلہ کی جو بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی تھیں، جو آپ کے ذریعے سے اللہ کے بے شمار بندوں تک پہنچیں، آخرت میں ان کا ظہور اس نہر کوثر اور حوض کوثر کی شکل میں ہو گا، جن سے اللہ کے بےشمار بندے فیضیاب اور سیراب ہونگے۔

۱۰۳) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَوْضِىْ مَسِيْرَةُ شَهْرٍ وَزَوَايَاهُ سَوَاءٌ مَاءُهٗ اَبْيَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَرِيْحُهٗ اَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ وَكِيْزَانُهٗ كَنُجُوْمِ السَّمَاءِ

مَنْ يَّشْرَبُ مِنْهَا فَلَا يَضْمَأُ اَبَدًا. (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ، رسول اللہ نے فرمایا: میرے حوض کی مسافت ایک مہینہ کی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حوض کوثر مجھے عطا فرمایا ہے وہ اس قدر طویل و عریض ہے کہ اسکی ایک جانب سے دوسری جانب تک ایک مہینہ کی مسافت ہے) اور اسکے زاویے (یعنی گوشے) بالکل برابر ہیں (اسکا مطلب بظاہر یہ ہے کہ وہ مربع ہے، اس کا طول و عرض یکساں ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے، اور اس کی خوشبو مشک سے بھی بہتر ہے، اور اسکے کوزے آسمان کے تاروں کی طرح ہیں (غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے ستارے جیسے حسین اور چمکدار ہیں، اور ان کی کثرت کی وجہ سے جس طرح انہیں گنا نہیں جاسکتا، اسی طرح میرے حوض کے کوزے بھی بے شمار اور حسین اور چمکدار ہیں) جو اس کا پانی پئے گا، وہ کبھی پیاس میں مبتلا نہیں ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

۱۰۴) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنِّیْ فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ اَبَدًا سَيَرِدَنَّ عَلَيَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُوْنَنِیْ ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِیْ وَبَيْنَهُمْ فَاَقُوْلُ اِنَّهُمْ مِنِّیْ فَيُقَالُ اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِیْ. (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے، رسول اللہ نے فرمایا: میں حوض کوثر پر تمہارا میر ساماں ہوں (اور تم سے آگے جاکے تمہاری پیاس کا انتظام کرنے والا ہوں) جو میرے پاس پہنچے گا، وہ آب کوثر سے پئے گا، اور جو اس کو پی لے گا پھر کبھی وہ پیاس میں مبتلا نہ ہوگا، اور وہاں کچھ لوگ جن کو میں بھی پہچانوں گا، اور وہ بھی مجھے پہچانیں گے میری طرف آئیں گے، لیکن میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ ڈال دی جائے گی (اور انہیں میرے پاس آنے سے روک دیا جائے گا) تو میں کہوں گا کہ یہ آدمی تو میرے ہیں، پس مجھے جواب دیا جائے گا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا نئی نئی باتیں نکالیں (اور کیا کیا رخنے ڈالے) تو میں کہوں گا کہ بربادی اور دوری ہو ان کے لئے جنہوں نے میرے بعد دین میں فرق ڈالا اور اسکو گڑبڑ کیا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح...... حدیث میں جن لوگوں کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وہ حوض کوثر پر رسول اللہ کے پاس جانے سے روک دیئے جائیں گے، اسکا تعین مشکل ہے، کہ یہ کون اور کس طبقے کے لوگ ہوں گے اور نہ اسکا معلوم کرنا ہمارے لئے ضروری ہے، اس حدیث کا خاص سبق ہمارے لئے تو بس یہ ہے کہ اگر ہم کوثر پر حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے آرزومند ہیں تو مضبوطی سے اس دین پر قائم رہیں، جو رسول اللہ ہمارے لئے لائے تھے، اور اس میں اپنی طرف سے کوئی ایجاد اور کوئی ردوبدل نہ کریں۔

۱۰۵) عَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَوْضِیْ مِنْ عَدَنَ اِلٰى عَمَّانَ الْبَلْقَاءِ مَاءُهٗ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَاَكْوَابُهٗ عَدَدُ نُجُوْمِ السَّمَاءِ مَنْ شَرِبَ مِنْهُ شَرْبَةً

لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا اَبَدًا اَوَّلُ النَّاسِ وُرُوْدًا فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ الشُّعْثُ رُؤُ سًا الدُّنِسُ ثِيَابًا اَلَّذِيْنَ لَا يَنْكِحُوْنَ الْمُتَنَعِّمَاتِ وَلَا يُفْتَحُ لَهُمُ السُّدَدُ. (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

ثوبان سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ: میرے حوض کی مسافت (اتنی ہے جتنی کہ) عدن سے عمانِ بلقاء تک، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، اور اسکے گلاس گنتی میں آسمان کے ستاروں کی طرح (بیشمار) ہیں (اسکے پانی کی یہ صفت ہے کہ) جو اس میں سے ایک دفعہ پی لے گا، اسے اسکے بعد کبھی پیاس کی تکلیف نہیں ہو گی، اس حوض پر سب لوگوں سے پہلے میرے پاس پہنچنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے، پریشان و پراگندہ سروں والے، میلے کچیلے کپڑوں والے، جن کا نکاح خوش حال و خوش عیش عورتوں سے نہیں ہو سکتا، اور جن کیلئے دروازے نہیں کھولے جاتے (یعنی جن کو خوش آمدید نہیں کہا جاتا)۔

تشریح..... عدنؔ مشہور مقام ہے، اور عمان بھی شام کے علاقہ کا مشہور شہر ہے، بَلْقاء عمان کے قریب ایک بستی تھی، بطور امتیاز اور نشانی کے اس حدیث میں "[illegible]" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں عدن اور بلقاء کے قریب والے عمان کے درمیان جتنا فاصلہ ہے، آخرت میں حوض کوثر کی مسافت اتنی ہو گی، اور واضح رہے کہ یہ بھی کوئی ناپی ہوئی مسافت نہیں ہے، کہ ٹھیک اتنے ہی میل اور اتنے ہی فرلانگ اور اتنے ہی فٹ ہوں۔ بلکہ حوض کی وسعت کو سمجھانے کے لئے عرف کے مطابق یہ ایک تقریبی بات کہی گئی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ حوض کی مسافت سینکڑوں میل کی ہو گی۔

آخر میں فرمایا گیا کہ سب سے پہلے حوض پر پہنچنے والے اور اس سے سیراب ہونیوالے وہ غریب مہاجرین ہوں گے جو اپنے فقر و تنگدستی اور دنیا کی بے رغبتی کی وجہ سے اس حال میں رہتے ہیں کہ، انکے سروں کے بال بنے سنورے نہیں رہتے، بلکہ بکھرے ہوئے اور الجھے ہوئے رہتے ہیں اور کپڑے بھی انکے اچھے اجلے نہیں رہتے، بلکہ میلے کچیلے رہتے ہیں، جو اگر نکاح کرنا چاہیں تو ان کی اس حالت کی وجہ سے خوش عیش اور خوش حال گھرانوں کی بیٹیاں انکے نکاحوں میں نہ دی جائیں، اور وہ کسی کے گھر پر جائیں، تو ان کے میلے کچیلے کپڑے، اور انکی شکل و صورت کی وجہ سے کوئی ان کے لئے اپنا دروازہ نہ کھولے، اور ان کو خوش آمدید نہ کہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے جن بندوں کا حال یہ ہو، کہ دنیا کی بے رغبتی اور دین میں انہماک اور فکر آخرت کے غلبہ کی وجہ سے اس دنیا میں وہ غریب و تنگدست ہو کر رہیں، نہ اپنی صورتوں کے بناؤ سنگار کی فکر رکھیں، نہ لباس پوشاک کی، وہ اپنی غربت اور دینوی عیش کی اس قربانی کی وجہ سے آخرت کے انعامات میں مقدم اور فائق رہیں گے، ہمارے اس زمانہ کے جو حضرات اس طرزِ عمل کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے "تقشف" اور رہبانیت پسندی اور دین کے غلط تصور کا نتیجہ سمجھتے ہیں، چاہئے کہ وہ اس قسم کی حدیثوں پر غور کریں۔

ہر زمانہ کے کچھ امراض ہوتے ہیں جس طرح پہلے کسی زمانہ میں واقعی رہبانیت اور ترک دنیا کی غلط اور غیر اسلامی صورتوں کو اسلام کا پسندیدہ زُہد بعض حلقوں میں سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا، اسی طرح ہمارے اس زمانے میں (شاید اسکے ردِ عمل میں) بعض حلقوں کا مستقل رجحان یہ ہے کہ اسلام کو اُس کی تعلیمات کو اس

دور کے مادہ پرستانہ اور نفس پرستانہ تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جائے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

۱۰۶) عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوْضًا وَاِنَّهُمْ لَيَتَبَاهُوْنَ اَيُّهُمْ اَكْثَرُ وَارِدَةً وَاِنِّىْ لَاَرْجُوْاَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ وَارِدَةً. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت سمرہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں ہر نبی کا ایک حوض ہوگا، اور انکے درمیان اس پر فخر ہوگا کہ ان میں سے کس کے پاس پینے والے زیادہ آتے ہیں، اور میں امید رکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ لوگ پینے کیلئے میرے پاس آئیں گے (اور میرے حوض سے سیراب ہوں گے)۔ (ترمذی)

۱۰۷) عَنْ اَنَسٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ اَنْ يَّشْفَعَ لِىْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَقَالَ اَنَا فَاعِلٌ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَيْنَ اَطْلُبُكَ قَالَ اُطْلُبْنِىْ اَوَّلَ مَا تَطْلُبُنِىْ عَلَى الصِّرَاطِ قُلْتُ فَاِنْ لَّمْ اَلْقَكَ عَلَى الصِّرَاطِ قَالَ فَاطْلُبْنِىْ عِنْدَالْمِيْزَانِ قُلْتُ فَاِنْ لَّمْ اَلْقَكَ عِنْدَ الْمِيْزَانِ قَالَ فَاطْلُبْنِىْ عِنْدَالْحَوْضِ فَاِنِّىْ لَا اُخْطِئُ هٰذِهِ الثَّلٰثَ الْمَوَاطِنَ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت انس (خادم رسول ﷺ) سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ قیامت کے روز آپ میری سفارش فرمائیے گا! آپ نے فرمایا، کہ میں تمہارا یہ کام کروں گا، میں نے عرض کیا تو (قیامت کے روز) میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا سب سے پہلے جب تمہیں میری تلاش ہو، تو صراط پر مجھے دیکھنا میں نے عرض کیا اگر میں آپ کو صراط پر نہ پا سکوں، تو پھر کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا، تو پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرنا! میں نے عرض کیا، اور اگر میں میزان کے پاس بھی آپ کو نہ پا سکوں، تو پھر کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا، تو پھر مجھے حوض کے پاس دیکھنا! کیونکہ میں اس وقت ان تین مقامات سے دور کہیں نہ جاؤں گا۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخرت کی شفاعت ایسی چیز ہے جسکی رسول ﷺ سے درخواست کی جا سکتی ہے اور اگرچہ اس حدیث میں حضور نے اپنے ملنے کے مقامات حضرت انسؓ کو بتلائے ہیں، لیکن دراصل شفاعت کے سب حاجت مندوں کے لئے حضور نے اپنے ملنے کے یہ پتے بتلائے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ توفنا على ملته واسعدنا بشفاعته

۱۰۸) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شِعَارُ الْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلَى الصِّرَاطِ رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ قیامت کے دن صراط پر اہل ایمان کا شعار (یعنی ان کا امتیازی وظیفہ) یہ دعائی کلمہ ہوگا، رب سلم سلم (اے ہمارے پروردگار ہمیں سلامت رکھ، اور سلامتی کے ساتھ پار لگا)۔

صراط اور میزان کا ذکر بعض حدیثوں میں پہلے بھی گذر چکا ہے۔

شفاعت

محشر میں پیش آنے والے جن واقعات کی اطلاع احادیث میں صراحت کے ساتھ دی گئی ہے اور جن پر ہر مؤمن کو یقین لانا ضروری ہے، ان میں سے ایک رسول اللہ ﷺ کی شفاعت بھی ہے، شفاعت کے متعلق حدیثیں اتنی کثرت سے وارد ہوئی ہیں کہ سب ملاکر تواتر کی حد کو پہنچ جاتی ہیں۔ پھر شفاعت کی ان حدیثوں کے مجموعہ سے سمجھ کر شارحین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی، اور بار بار ہوگی، سب سے پہلے جبکہ سارے اہل محشر اللہ کے جلال سے سراسیمہ اور خوفزدہ ہوں گے اور کسی کو لب ہلانے کی جرأت نہیں ہوگی، اور آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک تمام اولوالعزم پیغمبر بھی "نفسی نفسی" کے عالم میں ہوں گے اور کسی کے لئے شفاعت کی جرأت نہ کر سکیں گے، تو اس وقت عام اہل محشر کی درخواست پر، اور ان کی تکلیف سے متاثر ہو کر رسول اللہ نیاز مندی اور حسن ادب کے ساتھ (جو آپ کے شایان شان ہے) بارگاہ رب العزت میں اہل محشر کیلئے سفارش کریں گے، کہ ان کو اسکی فکر اور بے چینی کی حالت سے نجات دی جائے، اور ان کا حساب کتاب اور فیصلہ فرمادیا جائے۔ بارگاہِ جلالت میں اس دن یہ سب سے پہلی شفاعت ہوگی، اور یہ شفاعت صرف آپ ہی فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہی حساب اور فیصلہ کا کام شروع ہو جائے گا، یہ شفاعت جیسا کہ عرض کیا گیا عام اہل محشر کے لئے ہوگی، اسی لئے اس کو "شفاعت عظمیٰ" بھی کہتے ہیں، اسکے بعد آپ اپنی امت کے مختلف درجہ کے ان گنہگاروں کے بارے میں جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے سزاوار ہوں گے، یا جو جہنم میں ڈالے جاچکے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ ان کو معاف کر دیا جائے، اور جہنم سے ان کو نکالنے کی اجازت دے دی جائے، آپ کی یہ شفاعت بھی قبول ہوگی، اور اس کی وجہ سے خطاکار امتیوں کی بہت بڑی تعداد جہنم سے نکالی جائے گی، اسکے علاوہ کچھ صالحین امت کے لئے آپ اسکی بھی شفاعت کریں گے کہ ان کے لئے بغیر حساب کے داخلۂ جنت کا حکم دے دیا جائے۔ اسی طرح اپنے بہت سے امتیوں کے حق میں آپ ترقی درجات کی بھی اللہ تعالیٰ سے استدعا کریں گے، حدیثوں میں شفاعت کے ان تمام اقسام اور واقعات کی تفصیل وارد ہوئی ہے۔

پھر حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ شفاعت کا دروازہ کھل جانے کے بعد اور انبیاء علیہم السلام، ملائکہ عظام، اور اللہ کے دوسرے صالح اور مقرب بندے بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل ایمان کے حق میں سفارشیں کریں گے، یہاں تک کہ کم عمر میں فوت ہونے والے اہل ایمان کے معصوم بچے بھی اپنے ماں باپ کے لئے سفارشیں کریں گے، اسی طرح بعض اعمال صالحہ بھی اپنے عاملوں کے لئے سفارش کریں گے۔ اور یہ سفارشیں بھی قبول فرمائی جائیں گی، اور بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جن کی نجات اور بخشش ان ہی سفارشوں ہی کے بہانہ ہوگی۔

مگر لحاظ رہے کہ یہ سب شفاعتیں اللہ کے اذن سے اور اسکی مرضی اور اجازت سے ہوں گی، ورنہ کسی نبی اور کسی فرشتہ کی بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر کسی ایک آدمی کو بھی دوزخ سے نکال سکے،

یا اس کا اذن اور ایما پائے بغیر کسی کے حق میں سفارش کے لئے زبان کھول سکے،

قرآن پاک میں ہے:

مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ۔ (بقرہ ۲: ۲۵۵)

کون ہے جو اس کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے کسی کی سفارش کر سکے۔

دوسرے موقع پر فرمایا گیا:

وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (انبیاء ۲۱: ۲۸)

اور وہ نہیں سفارش کر سکیں گے مگر صرف اس کے لئے جسکے لئے اس کی رضا ہو۔

بلکہ علماء کرام نے جیسا کہ فرمایا ہے، شفاعت دراصل شفاعت کرنے والوں کی عظمت و مقبولیت کے اظہار کے لئے اور ان کے اکرام و اعزاز کے واسطے ہوگی، ورنہ حق تعالیٰ کے کاموں اور اسکے فیصلوں میں دخل دینے کی کسے مجال ہے۔ "یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید" اس کی شان ہے۔

اس تمہید کے بعد ذیل میں باب شفاعت کی حدیثیں پڑھئے!

۱۰۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُھُمْ فِیْ بَعْضٍ فَیَاتُوْنَ آدَمَ فَیَقُوْلُوْنَ اِشْفَعْ اِلٰی رَبِّکَ فَیَقُوْلُ لَسْتُ لَھَا وَلٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِاِبْرَاھِیْمَ فَاِنَّہٗ خَلِیْلُ الرَّحْمٰنِ فَیَاتُوْنَ اِبْرَاھِیْمَ فَیَقُوْلُ لَسْتُ لَھَا وَلٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِمُوْسٰی فَاِنَّہٗ کَلِیْمُ اللّٰہِ فَیَاتُوْنَ مُوْسٰی فَیَقُوْلُ لَسْتُ لَھَا وَلٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِعِیْسٰی فَاِنَّہٗ رُوْحُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ، فَیَاتُوْنَ عِیْسٰی فَیَقُوْلُ لَسْتُ لَھَا وَلٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِمُحَمَّدٍ فَیَاتُوْنِیْ فَاَقُوْلُ اَنَا لَھَا فَاَسْتَاذِنُ عَلٰی رَبِّیْ فَیُؤْذَنُ لِیْ وَیُلْھِمُنِیْ مَحَامِدَ اَحْمَدُہٗ بِھَا لَا تَحْضُرُنِی الْاٰنَ فَاَحْمَدُہٗ بِتِلْکَ الْمَحَامِدِ وَاَخِرُّ لَہٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَکَ وَ قُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ یَا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ فَیُقَالُ اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ شَعِیْرَۃٍ مِنْ اِیْمَانٍ فَاَنْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ فَاَحْمَدُہٗ بِتِلْکَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّ لَہٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَکَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَہٗ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ یَا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ فَیُقَالُ اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ اَوْ خَرْدَلَۃٍ مِنْ اِیْمَانٍ فَاَنْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ فَاَحْمَدُہٗ بِتِلْکَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّ لَہٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَکَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَہٗ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ یَارَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ فَیُقَالُ اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ اَدْنٰی اَدْنٰی اَدْنٰی مِثْقَالِ حَبَّۃِ خَرْدَلَۃٍ مِنْ اِیْمَانٍ فَاَخْرِجْہُ مِنَ النَّارِ فَاَنْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ الرَّابِعَۃَ فَاَحْمَدُہٗ بِتِلْکَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّ لَہٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَکَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَہٗ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ یَا رَبِّ اِئْذَنْ لِیْ فِیْمَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ لَیْسَ ذَالِکَ لَکَ وَلٰکِنْ وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ وَکِبْرِیَائِیْ وَعَظْمَتِیْ لَاُخْرِجَنَّ مِنْھَا مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، کہ: جب قیامت کا دن ہوگا (اور سب اولین و آخرین میدانِ حشر میں جمع ہوں گے) تو لوگوں میں سخت اضطراب اور اژدحام کی کیفیت ہوگی، پس وہ لوگ (یعنی اہلِ محشر کے کچھ نمائندے) آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے، کہ اپنے رب سے ہماری سفارش کردیجئے (کہ ہمیں اس حالت سے چھٹکارا ملے) آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق اور اس مرتبہ کا نہیں ہوں، لیکن تم کو چاہئے کہ ابراہیم کے پاس جاؤ وہ اللہ کے خلیل ہیں (شاید وہ تمہارے کام آسکیں) پس وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان کے سامنے شفاعت کا اپنا سوال رکھیں گے) وہ بھی فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، لیکن تمہیں موسیٰ کے پاس جانا چاہئے وہ اللہ کے کلیم ہیں (جنہیں اللہ نے بلا واسطہ اپنی ہمکلامی کا شرف بخشا ہے) شاید وہ تمہارا کام کر سکیں، پس وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور اپنی وہی عرض ان کے سامنے رکھیں گے) وہ بھی یہی فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں لیکن تمہیں عیسیٰ کے پاس جانا چاہئے، وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں (یعنی اللہ نے انکو انسانی پیدائش کے عام مقررہ اسباب کے بغیر صرف اپنے حکم سے پیدا کیا ہے، اور ان کو غیر معمولی قسم کی روح اور روحانیت بخشی ہے) تم ان کی خدمت میں جاؤ، شاید وہ تمہارے لئے حق تعالیٰ سے عرض کرنے کی جرأت کر سکیں، پس یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) وہ بھی یہی فرمائیں گے کہ میں اس کام کا اور اس مرتبہ کا نہیں ہوں، تم کو (اللہ کے آخری نبی) محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے (رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ) پھر وہ لوگ میرے پاس آئیں گے، (اور شفاعت کے لئے مجھ سے کہیں گے) پس میں کہوں گا، کہ میں اس کام کا ہوں (اور یہ میرا ہی کام ہے) پس میں اپنے رب کریم کی بارگاہ خاص میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا، مجھے اجازت دے دی جائے گی (میں وہاں حاضر ہو جاؤں گا) اور اللہ تعالیٰ اس وقت مجھے اپنی کچھ خاص تعریفیں اپنی حمد کے لئے الہام فرمائیں گے (جو اسوقت مجھے معلوم نہیں ہیں) تو اس وقت میں انہی الہامی محامد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کروں گا، اور اسکے آگے سجدہ میں گر جاؤں گا (مسند احمد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہاں ایک ہفتہ تک سجدہ میں پڑے رہیں گے، اس کے بعد) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو فرمایا جائے گا، کہ اے محمد! سر اُٹھاؤ، اور جو کہنا ہو کہو، تمہاری سنی جائے گی، اور جو مانگنا ہو مانگو تم کو دیا جائے گا، اور جو سفارش کرنا چاہو کرو، تمہاری مانی جائے گی، پس میں کہوں گا اے پروردگار! میری امت، میری امت! (یعنی میری امت پر آج رحم فرمایا جائے اور اس کو بخش دیا جائے) پس مجھ سے کہا جائے گا، جاؤ اور جس کے دل میں جَو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو نکال لو، پس میں جاؤں گا، اور ایسا کروں گا (یعنی جن کے دل میں جَو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا، اسکو نکال لاؤں گا) اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ کرم کی طرف لوٹوں گا اور پھر ان ہی الہامی محامد کے ذریعے اس کی حمد و ثنا کروں گا، اور اس کے آگے پھر سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا، اے محمد!

سر اُٹھاؤ، اور جو کہنا ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی، اور جو مانگنا ہو مانگو تم کو دیا جائے گا، اور جو سفارش کرنا چاہو کرو، تمہاری شفاعت مانی جائے گی، پس میں عرض کروں گا اے پروردگار! میری امت، میری امت! تو مجھ سے فرمایا جائے گا، کہ جاؤ اور جن کے دل میں ایک ذرہ کے بقدر (یا فرمایا، کہ رائی کے دانہ کے بقدر) بھی ایمان ہو، ان کو بھی نکال لو، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، کہ میں جاؤں گا اور ایسا کروں گا، (یعنی جن کے دلوں میں ذرہ برابر، یا رائی کے دانہ کے برابر نورِ ایمان ہو گا ان کو بھی نکال لاؤں گا) اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ کرم کی طرف پھر لوٹوں گا اور پھر ان ہی الہامی محامد کے ذریعہ اُس کی حمد و ثنا کروں گا، اور اسکے آگے پھر سجدہ میں گر جاؤں گا پس مجھ سے فرمایا جائے گا، اے محمد! اپنا سر اٹھاؤ، اور جو کہنا ہو کہو، تمہاری سنی جائیگی اور جو مانگنا چاہو مانگو، تم کو دیا جائے گا، اور جو سفارش کرنا چاہو کرو، تمہاری سفارش قبول کی جائے گی، پس میں عرض کروں گا، میرے رب! میری امت، میری امت! پس مجھ سے فرمایا جائے گا، جاؤ اور جن کے دل میں رائی کے دانہ سے کم سے کمتر بھی ایمان ہو، ان کو بھی نکال لو، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، کہ پس میں جاؤں گا اور ایسا کروں گا (یعنی جن کے دل میں رائی کے دانہ سے کم سے کمتر بھی ایمان کا نور ہو گا، ان کو بھی نکال لاؤں گا) اور اسکے بعد چوتھی دفعہ پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ کرم کیطرف لوٹ آؤں گا،، اور ان ہی الہامی محامد کے ذریعے اس کی حمد کروں گا پھر اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤں گا، پس مجھ سے فرمایا جائے گا، اے محمد! اپنا سر سجدہ سے اٹھاؤ، اور جو کہنا ہو کہو، تمہاری سنی جائے گی اور جو مانگنا چاہو مانگو، تم کو دیا جائے گا، اور جو سفارش کرنا چاہو کرو، تمہاری سفارش مانی جائے گی، پس میں عرض کروں گا، کہ اے پروردگار! مجھے اجازت دیجئے کہ ان سب کے حق میں جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہ کام تمہارا نہیں ہے، لیکن میری عزت و جلال اور میری عظمت و کبریائی کی قسم، میں خود دوزخ سے ان سب کو نکال لوں گا، جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح...... اس حدیث میں چند باتیں تشریح طلب ہیں:

۱) حدیث میں جو کے برابر، رائی کے دانہ کے برابر، اور رائی کے دانہ سے کم سے کمتر، دل میں ایمان ہونے کا جو ذکر ہے، اس سے مراد نورِ ایمان اور ثمراتِ ایمان کے خاص خاص درجے ہیں۔ جن کا ادراک ہم کو تو نہیں ہوتا، لیکن حضور ﷺ کی بصیرت اس وقت اس کا ادراک کر لے گی، اور آپ ان درجوں والوں کو اللہ کے حکم سے نکال لائیں گے۔

۲) حدیث کے آخری حصے میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے لئے تین دفعہ شفاعت فرمانے کے بعد چوتھی دفعہ حق تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں اجازت دی جائے جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو، اس کا مطلب بظاہر یہ ہے جن لوگوں نے آپ کی دعوتِ توحید کو تو قبول کر لیا، اور ایمان لے آئے، لیکن دوزخ سے نجات پانے اور جنت میں جانے کے لئے جو اور اعمال کرنا چاہئے تھے، وہ انہوں نے بالکل نہیں کئے، تو مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ آخر میں ایسے لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنے کی اجازت چاہیں گے جن کے پاس کسی درجہ کا

مجرد ایمان اور توحید کا اعتقاد تو ہوگا لیکن عمل خیر سے وہ بالکل خالی ہوں گے (بخاری و مسلم ہی کی ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں غالباً اسی گروہ کے حق میں "لم یعملوا خیرا قط" کے الفاظ آئے ہیں، جن کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہوگا) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "لیس ذالک لک" یعنی ان مسکینوں کو جہنم سے نکالنے کا کام میں نے آپ کیلئے نہیں رکھا، یا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لئے یہ سزاوار اور مناسب نہیں ہے، بلکہ یہ کام میری عزت وجلال اور میری عظمت و کبریائی اور شان "فعال لما یرید" کے لئے ہی سزاوار ہے، اسلئے اس کو میں خود ہی کروں گا۔ اس عاجز کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لاکر احکام کی تعمیل بالکل نہیں کی، ایسوں کو دوزخ سے نکالنا پیغمبر کے لئے مناسب نہیں ہے، اس درجہ کا عفو و درگزر اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔ واللہ اعلم۔

۳) معلوم ہوتا ہے اس روایت میں اختصار سے کام لیا گیا ہے چنانچہ اسی حدیث کی صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں آدمؑ کے بعد اور ابراہیمؑ سے پہلے اہل محشر کے نوح علیہ السلام کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا ذکر ہے جو اس میں نہیں ہے۔ نیز اس میں صرف اپنی امت کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا ذکر ہے، حالانکہ قرین قیاس یہ ہے کہ پہلے آپ عام اہل محشر کیلئے حساب اور فیصلہ کی شفاعت فرمائیں گے جس کو "شفاعت کبریٰ" کہتے ہیں، پھر جب حساب کے نتیجہ میں بہت سے آپ کے امتی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے دوزخ کی طرف بھیج دیئے جائیں گے، تو آپ ان کو دوزخ سے نکالنے اور جنت میں داخل کرانے کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔ واللہ اعلم۔

۴) اہل محشر کے جو نمائندے کسی شفیع کی تلاش میں نکلیں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے دل میں یہی ڈالے گا، کہ وہ پہلے آدم علیہ السلام کی خدمت میں اور پھر ان کی رہنمائی اور مشورہ سے نوح علیہ السلام کی خدمت میں اور پھر اسی طرح ابراہیم اور موسیٰ و عیسیٰ (علیہم السلام) کی خدمت میں حاضر ہوں یہ سب منجانب اللہ اس دن اسلئے ہوگا کہ عملی طور پر سب کو معلوم ہو جائے کہ اس شفاعت کا منصب اور "مقام محمود" اسکے آخری نبی کے لئے مخصوص ہے۔

بہر حال اس دن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور رفعت مقام کے برسر محشر اظہار کے لئے ہوگا۔

۱۱۰) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُخْرَجُ قَوْمٌ مِنْ أُمَّتِيْ مِنَ النَّارِ بِشَفَاعَتِيْ يُسَمَّوْنَ الْجَهَنَّمِيِّيْنَ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: عمران بن حصین سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ایک گروہ میری امت میں سے میری شفاعت سے دوزخ سے نکالا جائے گا، جن کو "جہنمیین" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ (بخاری)

تشریح: ..... ان کی توہین و تنقیص نہ ہوگی، بلکہ جہنم سے نکالے جانے کی وجہ سے ان کا یہ نام پڑ جائے گا، جو ان کے لئے خوشی کا باعث ہوگا، کیونکہ یہ اللہ کے کرم کو یاد دلائے گا۔

۱۱۱) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَتَانِىْ آتٍ مِنْ عِنْدِ رَبِّىْ فَخَيَّرَنِىْ بَيْنَ اَنْ يُدْخِلَ نِصْفَ اُمَّتِى الْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ وَهِىَ لِمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا.

حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے کہتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا پیغام لے کر آیا، اس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا کہ میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لوں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ میری نصف امت کو جنت میں داخل فرمادیں، یا یہ کہ مجھے شفاعت کا موقع ملے، تو میں نے حق شفاعت کو اختیار کر لیا اور میری شفاعت ان لوگوں کے لئے ہو گی، جو (ایمان اور توحید کی میری دعوت کو قبول کر کے) اس حال میں مرے، کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے۔

۱۱۲) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِىْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ نَفْسِهٖ۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: قیامت کے دن میری شفاعت سے بہرہ مند وہی ہوں گے جنہوں نے خلوصِ قلب سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو۔

تشریح...... اس حدیث کا بھی مطلب وہی ہے جو اوپر والی حدیث میں دوسرے لفظوں میں فرمایا گیا، یعنی جو شرک کی بیماری میں مبتلا ہوگا اس کو شفاعت سے فائدہ نہ ہوگا، ہاں اگر شرک سے پاک ہو گیا ہے، اور دوسرے قسم کے گناہ ہیں، تو اس کو رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے فائدہ ہوگا۔

۱۱۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ شَفَاعَتِىْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِىْ۔ (رواہ الترمذی و ابو داؤد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے، (ترمذی و ابو داؤد) اس حدیث کو ابن ماجہ نے بجائے حضرت انس کے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔

تشریح...... اس قسم کی حدیثوں سے نڈر اور بے خوف ہو کر گناہوں پر اور زیادہ جری ہو جانا بڑا کمینہ پن ہے، حضور ﷺ کے اس قسم کے ارشادات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے شامتِ نفس سے گناہ ہو جائیں، وہ بھی مایوس اور ناامید نہ ہوں، میں ان کی شفاعت کروں گا اسلئے وہ شفاعت کا استحقاق پیدا کرنے کیلئے اللہ کے ساتھ اپنے بندگی کے تعلق کو، اور میرے امتی ہونے کے تعلق کو درست کرنے کی فکر کریں۔

۱۱۴) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَلَا قَوْلَ اللهِ تَعَالٰى فِىْ اِبْرَاهِيْمَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَقَالَ عِيْسٰى اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اُمَّتِىْ اُمَّتِىْ وَبَكٰى فَقَالَ اللهُ تَعَالٰى يَا جِبْرَئِيْلُ اذْهَبْ اِلٰى مُحَمَّدٍ . وَرَبُّكَ

اَعْلَمُ . فَسَلْهُ مَايُبْكِيْهِ فَاَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ فَسَأَلَهُ فَاَخْبَرَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِمَا قَالَ فَقَالَ اللهُ لِجِبْرَئِيْلَ اِذْهَبْ اِلٰى مُحَمَّدٍ فَقُلْ اِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ اُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْءُكَ. (رواه مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی:

"رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ"

(میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، یعنی ان کی وجہ سے بہت سے آدمی گمراہ ہوئے، پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں، پس ان کے لئے تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کو تو بخش ہی دے) اور عیسیٰ کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا، جو قرآن پاک میں ہے:

"اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ".

(اے اللہ! اگر میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں، تو یہ آپ کے بندے ہیں، یعنی آپ کو عذاب و سزا کا پورا حق ہے) یہ دونوں آیتیں تلاوت فرما کر رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو یاد کیا، اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، اور کہا: "اے میرے اللہ! میری امت، میری امت! اور آپ اس دعا میں روئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو فرمایا، تم محمد کے پاس جاؤ۔ اور اگرچہ تمہارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے مگر پھر بھی تم جاکر ہماری طرف سے پوچھو، کہ ان کے اس رونے کا کیا سبب ہے۔ پس جبرئیل آپ کے پاس آئے، اور آپ سے پوچھا، آپ نے جبرئیل کو وہ بتلا دیا جو اللہ سے عرض کیا تھا (یعنی یہ کہ اس وقت میرے رونے کا سبب امت کی فکر ہے، جبرئیل نے جاکر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا) تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو فرمایا، کہ محمد کے پاس جاؤ، اور ان کو ہماری طرف سے کہو، کہ تمہاری امت کے بارہ میں ہم تمہیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمہیں رنجیدہ اور غمگین نہیں کریں گے۔ (مسلم)

......حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی دو آیتوں کی تلاوت فرمائی، ایک سورۂ ابراہیم کی آیت، جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم اور اپنی امت کے بارے میں عرض کیا، کہ "فمن تبعني فانه مني ومن عصاني فانك غفور رحيم" (یعنی ان میں سے جن لوگوں نے میری بات مانی وہ تو میرے ہیں (اور میں ان کے لئے آپ سے مغفرت کی درخواست کرتا ہوں) اور جنہوں نے میری نافرمانی کی، تو آپ غفور رحیم ہیں، چاہیں تو ان کو بھی بخش سکتے ہیں)۔ اور دوسری آیت سورۂ مائدہ کی، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ذکر ہے، کہ وہ اپنے گمراہ امتیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے، کہ "ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم" (اگر آپ ان کو عذاب دیں، تو یہ آپ کے بندے ہیں، اور آپ کو عذاب دینے کا پورا حق ہے، اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو آپ غالب ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں) اور حکیم ہیں (جو کچھ کریں گے حکمت کے مطابق ہی ہوگا)۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ کے دونوں جلیل القدر

پیغمبروں نے پورے ادب، اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی اپنی امتوں کے خطاکار لوگوں کے لئے دبے لفظوں میں سفارش کی ہے۔

ان آیتوں کی تلاوت نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کا مسئلہ یاد دلایا، اور آپ نے ہاتھ اٹھاکر اور رو کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی فکر کو عرض کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا، کہ آپ کی امت کا مسئلہ آپ کی مرضی اور خوشی کے مطابق ہی طے کردیا جائے گا اور اس معاملہ کی وجہ سے آپ کو رنجیدہ اور غمگین ہونا نہیں پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر کو اپنی امت کے، بلکہ ہر مقتدا کو اپنے متبعین اور منتسبین کے ساتھ ایک خاص قسم کی شفقت کا تعلق ہوتا ہے جس طرح کہ ہر شخص کو اپنی اولاد کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتا، اور اس تعلق کی وجہ سے ان کی قدرتی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے چھٹکارا پائیں، اور اس شفقت اور رأفت میں رسول اللہ ﷺ سب پیغمبروں سے بڑھے ہوئے ہیں اور اسلئے قدرتی طور پر آپ کی یہ بڑی خواہش ہے، جو مختلف موقعوں پر بار بار آپ سے ظاہر ہوئی کہ آپ کی امت دوزخ میں نہ جائے، اور جن کی بد عملی اس درجہ کی ہو، کہ ان کا دوزخ میں ڈالا جانا، اور کچھ عذاب پانا ناگزیر ہو ان کو کچھ سزا پانے کے بعد نکال لیا جائے، چنانچہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوچکا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خواہش کو پورا فرمائیں گے، اور آپ کی شفاعت سے بہت سے لوگ جہنم سے بچ جائیں گے، اور بہت سے ڈالے جانے کے بعد نکال لئے جائینگے۔

شفاعت کے سلسلے کی حدیثوں میں صحیح مسلم کی یہ حدیث ہم جیسے خطاکاروں، گنہگاروں کیلئے بڑا سہارا ہے اور اس میں بڑی بشارت ہے، بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سن کر فرمایا: میں تو جب مطمئن اور خوش ہوں گا جب میرا کوئی امتی بھی دوزخ میں نہیں رہے گا۔ ع

برین مژدہ گر جاں فشانم رواست

ف..... اللہ تعالیٰ کو بطور خود سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود رونے کا سبب پوچھنے کے لئے حضرت جبرئیل کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجنا صرف آپ کے اکرام و اعزاز کے طور پر تھا، کہ اپنے مقربین کے ساتھ بادشاہوں کا یہی طرز ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۱۵) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَلٰثَةٌ اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ. (رواہ ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت میں تین طرح کے لوگ (خصوصیت سے) شفاعت کریں گے، انبیاء، پھر دین کا علم رکھنے والے اور پھر شہداء۔ (ابن ماجہ)

تشریح..... حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان تین گروہوں سے باہر کا کوئی شخص کسی کی سفارش نہیں کرسکے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خاص شفاعت انہی تین گروہ والوں کی ہوگی، لیکن انکے علاوہ بعض ان

صالحین کو بھی اذن شفاعت ملے گا جو ان تینوں میں سے کسی گروہ میں بھی نہیں ہوں گے، بلکہ جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے چھوٹے بچے بھی اپنے ماں باپ کی سفارش کریں گے، اور اعمالِ صالحہ کی بھی شفاعت ہوگی۔

۱۱۶) **عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْفِئَامِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْقَبِیْلَةِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْعَصَبَةِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰی یَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ۔** (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ: میری امت میں بعض افراد وہ ہوں گے، جو جماعتوں اور قوموں کی شفاعت کریں گے (یعنی ان کا مقام یہ ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ ان کو قوموں کی شفاعت کی اجازت دے گا، اور قوموں کے حق میں انکی سفارش قبول فرمائے گا) اور بعض وہ ہوں گے جو عصبہ (یعنی دس سے چالیس تک کی تعداد والی کسی پارٹی) کے بارے میں شفاعت کریں گے، اور بعض وہ ہوں گے جو ایک آدمی کی سفارش کر سکیں گے (اور اللہ تعالیٰ ان سب کی شفاعتیں قبول فرمائے گا) یہاں تک کہ سب جنت میں پہنچ جائیں گے۔ (ترمذی)

۱۱۷) **عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُصَفُّ اَهْلُ النَّارِ فَیَمُرُّبِهِمُ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ یَا فُلَانُ اَمَا تَعْرِفُنِیْ اَنَا الَّذِیْ سَقَیْتُكَ شَرْبَةً وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا الَّذِیْ وَهَبْتُ لَكَ وَضُوْءً فَیَشْفَعُ لَهٗ فَیُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ.** (رواه ابن ماجه)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: آخرت میں صف باندھے کھڑے کئے جائیں گے اہلِ دوزخ (یعنی اہلِ ایمان میں سے کچھ گنہگار لوگ جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ میں سزا پانے کے مستحق ہوں گے، وہ آخرت میں کسی موقع پر صف باندھے کھڑے ہوں گے) پس ایک شخص اہلِ جنت میں اسکے پاس سے گذرے گا، تو صف والوں میں سے ایک شخص اس گذرنے والے جنتی کو پکار کرکہیگا اے فلاں! کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہ ہوں، کہ ایک دفعہ میں نے تم کو پانی پلایا تھا (یا شربت وغیرہ، پینے کی کوئی اچھی چیز پلائی تھی) اور اسی صف والوں میں سے کوئی اور کہے گا، کہ میں نے تمہیں وضو کیلئے پانی دیا تھا، پس یہ شخص ان لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے سفارش کریگا اور انکو جنت میں داخل کرادیگا۔ (ابن ماجہ)

تشریح..... اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ دنیا میں صالحین سے محبت اور قربت کا تعلق اپنی عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی انشاء اللہ بہت کچھ کام آنے والا ہے، بشرطیکہ ایمان نصیب ہو، افسوس! ان چیزوں میں جس طرح بہت سے جاہل عوام سخت غلو اور افراط میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے ہیں، اسی طرح ہمارے زمانے کے بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے سخت تفریط میں مبتلا ہیں۔

جنت اور دوزخ کی حقیقتیں

عالمِ آخرت کی جن حقیقتوں پر ایمان لانا ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے اور جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مؤمن و مسلم نہیں ہو سکتا، ان ہی میں سے جنت و دوزخ بھی ہیں، اور یہی دونوں مقام انسانوں کا

آخری اور پھر ابدی ٹھکانا ہیں، قرآن مجید میں بھی جنت اور اس کی نعمتوں کا اور دوزخ اور اس کی تکلیفوں کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے اور ان دونوں کے متعلق اتنا کچھ بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر اس سلسلے کی سب آیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو صرف انہی سے اچھی خاصی ایک کتاب تیار ہو جائے۔

اسی طرح کتبِ حدیث میں بھی جنت و دوزخ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی صد ہا حدیثیں محفوظ ہیں جن سے ان دونوں کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں، پھر بھی یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ قرآن مجید میں اور اسی طرح احادیث میں جنت و دوزخ کے متعلق جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کی پوری اور اصلی حقیقت کا علم وہاں پہنچ کر، اور مشاہدہ کے بعد ہی حاصل ہو سکے گا، جنت تو جنت ہے، اگر کوئی شخص ہماری اس دنیا ہی کے کسی بارونق شہر کے بازاروں کا اور وہاں کے باغوں اور گلزاروں کا ذکر ہمارے سامنے کرے، تو اسکے بیان سے جو تصور ہمارے ذہنوں میں قائم ہوتا ہے، ہمیشہ کا تجربہ ہے کہ وہ اصل کے مقابلہ میں ہمیشہ بہت ناقص ہوتا ہے، بہر حال اس نفس الامری حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن و حدیث میں جنت یا دوزخ کے بیان کو پڑھنا چاہئے۔

دراصل آیات یا احادیث میں جنت اور دوزخ کا جو ذکر فرمایا گیا ہے، اس کا یہ مقصد ہی نہیں ہے، کہ لوگوں کے سامنے وہاں کا مکمل جغرافیہ اور وہاں کے احوال کا پورا نقشہ آجائے بلکہ اسکا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں میں دوزخ اور اسکے عذاب کا خوف پیدا ہو، اور وہ ان برائیوں سے بچیں جو دوزخ میں لے جانے والی ہیں، اور جنت اور اس کی بہاروں اور لذتوں کا شوق ابھرے، تاکہ وہ اچھے اعمال اختیار کریں، جو جنت میں پہنچانے والے ہیں، اور وہاں کی نعمتوں کا مستحق بنانے والے ہیں، پس اس سلسلہ کی آیات اور احادیث کا اصلی حق یہی ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے شوق اور خوف کی یہ کیفیتیں پیدا ہوں۔

۱۱۸) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَالَ اللهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُ لِعِبَادِىَ الصّٰلِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ وَاقْرَءُوا اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِىَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ. (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے، اور نہ کسی بشر کے دل میں کبھی ان کا خطرہ یا خیال ہی گذرا ہے، اور اگر تم چاہو تو پڑھو قرآن کی یہ آیت: "فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین" (جس کا مطلب یہ ہے، کہ کوئی آدمی بھی ان نعمتوں کو نہیں جانتا جو ان بندوں کے لئے (جو راہ خدا میں اپنا محبوب مال خرچ کرنے والے ہیں، اور راتوں کو عبادتِ خداوندی میں مصروف رہنے والے ہیں) چھپا کے اور محفوظ کر کے رکھی گئی ہیں جن میں ان کی آنکھوں کے لئے ٹھنڈک کا سامان ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح۔۔۔۔ یہ حدیث قدسی ہے، رسول اللہ ﷺ جب کوئی بات اس تصریح کے ساتھ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے (اور وہ قرآن مجید کی آیت نہ ہو) تو ایسی حدیث کو "حدیث قدسی" کہتے ہیں، یہ حدیث شریف بھی اسی قسم کی ہے، اس میں اللہ کے بندوں کے لئے بشارت اور خوشی کا ایک عام اور ظاہر پہلو تو یہ ہے کہ دارِ

آخرت میں ان کو ایسی اعلیٰ قسم کی نعمتیں ملیں گی جو دنیا میں کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئیں، بلکہ کسی آنکھ نے بھی انکو نہیں دیکھا، اور نہ کسی کان نے ان کا حال سنا، اور نہ کبھی کسی انسان کے دل میں ان کا خیال ہی آیا، اور بشارت و مسرت کا دوسرا خاص پہلو، محبت و شفقت اور عنایت و کرم سے بھرے ہوئے رب کریم کے ان الفاظ میں ہے کہ "اعددت لعبادی" (میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسی ایسی نعمتیں تیار کر کے رکھی ہیں، الخ) قربان ہوں بندے اپنے رب کریم کے اس کرم پر۔

۱۱۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَوْضِعُ سَوْطٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا.

(رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "جنت میں ایک کوڑے کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح..... عرب کا یہ رواج تھا، کہ جب چند سواروں کا قافلہ چلتا، تو جو سوار منزل پر اترتے وقت جہاں قیام کرنا چاہتا، وہاں اپنا کوڑا ڈال دیتا، پھر وہ جگہ اسی کی سمجھی جاتی، اور کوئی دوسرا اس پر قبضہ نہ کرتا، تو اس حدیث میں کوڑے کی جگہ سے مراد دراصل اتنی مختصر سی جگہ ہے، جو کوڑا ڈال دینے سے کوڑا والے سوار کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے، جس میں وہ اپنا بستر لگا لے، یا خیمہ ڈال لے، تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جنت کی تھوڑی سے تھوڑی جگہ بھی دنیا و مافیہا سے بہتر اور زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے فانی ہے اور جنت اور اسکی ہر نعمت باقی ہے، اور فانی اور باقی کا کیا مقابلہ۔

۱۲۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ غَدْوَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ اَوْرَوْحَةٌ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا وَلَوْاَنَّ امْرَأَةً مِنْ نِّسَاءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اِطَّلَعَتْ اِلَی الْاَرْضِ لَاَضَاءَتْ مَا بَیْنَهُمَا وَلَمَلَأَتْ مَا بَیْنَهُمَا رِیْحًا وَلَنَصِیْفُهَا عَلٰی رَأْسِهَا خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا. (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: راہ خدا میں ایک دفعہ صبح کا نکلنا یا شام کا نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اور اگر اہل جنت کی بیویوں میں سے کوئی عورت زمین کی طرف جھانکے تو ان دونوں کے درمیان (یعنی جنت سے لے کر زمین تک) روشنی ہی روشنی ہو جائے، اور مہک اور خوشبو سے بھر جائے، اور اسکے سر کی صرف اوڑھنی بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (بخاری)

تشریح..... حدیث کے ابتدائی حصے میں راہِ خدا میں نکلنے کی یعنی خدمتِ دین کے کسی سلسلہ میں سفر کرنے اور چلنے پھرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ایک دفعہ صبح کا یا شام کا نکلنا بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور یہاں صبح شام کا ذکر غالباً صرف اسلئے کر دیا گیا ہے کہ صبح یا شام ہی کو سفر پر روانہ ہونے کا دستور تھا، ورنہ اگر کوئی شخص مثلاً دن کے درمیانی حصے میں خدمتِ دین کے کسی سلسلے میں جائے، تو یقیناً اسکے اس جانے کی بھی وہی فضیلت ہے پھر حدیث کے دوسرے حصے میں اہل جنت کی جنتی بیویوں کے غیر معمولی حسن و جمال اور ان کے لباس کی قدر و قیمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس موقع پر اس کے ذکر کرنے کا مقصد غالباً اہل ایمان کو خدمتِ دین کے

سلسلے کے کاموں کے لئے گھر چھوڑ کر نکلنے کی ترغیب دینا، اور یہ بتلانا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں اور گھر والیوں کو عارضی طور پر چھوڑ کر تھوڑے سے وقت کے لئے بھی راہِ خدا میں نکلو گے تو جنت میں ایسی بیویاں ہمیشہ ہمیشہ تمہاری رفیق اور زندگی کی شریک رہیں گی، جن کے حسن و جمال کا یہ عالم ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اس زمین کی طرف ذرا جھانکے تو زمین اور آسمان کے درمیان کی ساری فضا روشن اور معطر ہو جائے، اور جن کا لباس اس قدر قیمتی ہے، کہ صرف سر کی اوڑھنی اس دنیا و مافیہا سے بہتر اور بیش قیمت ہے۔

۱۲۱) **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ شَجَرَةً یَسِیْرُ الرَّاكِبُ فِیْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَا یَقْطَعُهَا وَلَقَابَ قَوْسِ اَحَدِكُمْ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ اَوْ تَغْرُبُ.**

(رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ سوار اسکے سایے میں سو سال چلے اور پھر بھی اس کو پار نہ کر سکے، اور جنت میں تم میں سے کسی کی کمان کے بقدر جگہ بھی اس ساری کائنات سے بہتر ہے، جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے، یا غروب ہوتا ہے۔

تشریح..... حدیث کا مقصد دنیا اور اس کی راحتوں اور لذتوں کے مقابلے میں جنت اور اسکی نعمتوں کی بالاتری بیان فرماکے اس کا شوق دلوں میں پیدا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اور راحت کے جو سامان اپنے بندوں کے لئے جنت میں پیدا کئے ہیں، ان میں سے ایک جنت کے وہ طویل و عریض سایہ دار درخت ہیں جن کا سایہ اتنے وسیع رقبہ پر پڑتا ہے، کہ سوار سو سال میں بھی اس کو طے نہیں کر سکتا، اور دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جنت میں ایک کمان کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، ابھی اوپر عرب کے اس دستور کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ کوئی سوار جب کہیں اترنا چاہتا تھا، تو اس جگہ اپنا کوڑا ڈال دیتا تھا اس سے اس جگہ پر اس کا حق قائم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک دستور یہ تھا کہ جب کوئی پیدل آدمی کسی جگہ منزل کرنا چاہتا تھا، تو وہ اپنی کمان وہاں ڈال دیتا تھا، اور اس طرح وہ جگہ اس کے لئے مخصوص ہو جاتی تھی، پس اس حدیث میں کمان کی جگہ سے مراد گویا ایک آدمی کی منزل ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایک پیادہ مسافر کمان ڈال کے جتنی جگہ کا مستحق ہو جاتا ہے، جنت کی اتنی مختصر سی جگہ بھی اس دنیا کی اس ساری کائنات سے زیادہ قیمتی اور بہتر ہے، جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

۱۲۲) **عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ یَاْكُلُوْنَ فِیْهَا وَیَشْرَبُوْنَ وَلَا یَتْفُلُوْنَ وَلَا یَبُوْلُوْنَ وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ قَالُوْا فَمَا بَالُ الطَّعَامِ قَالَ جُشَاءٌ وَرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ یُلْهَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ وَالتَّحْمِیْدَ كَمَا تُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ.** (رواه مسلم)

ترجمہ جابرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "اہل جنت جنت میں کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی، لیکن نہ تو انہیں تھوک آئے گا، اور نہ پیشاب پاخانہ ہوگا، اور نہ ان کی ناک سے ریزش آئے گی۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا، تو کھانے کا کیا ہوگا؟ (یعنی جب پیشاب پاخانہ کچھ بھی نہ ہوگا تو جو کچھ کھایا جائے گا وہ آخر کہاں جائے گا؟) آپ نے فرمایا کہ ڈکار اور پسینہ مشک کے پسینہ کی طرح (یعنی

غذا کا جو اثر نکلنا ہوگا، وہ انہی دو طریقوں سے نکل جایا کرے گا) اور ان اہل جنت کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی حمد و تسبیح اس طرح جاری ہوگی، جس طرح تمہارا سانس جاری رہتا ہے۔"

تشریح...... مطلب یہ ہے کہ جنت کی ہر غذا کثیف مادہ سے پاک ایسی لطیف اور نورانی ہوگی، کہ پیٹ میں اسکا کوئی فضلہ تیار نہیں ہوگا، بس ایک خوشگوار ڈکار کے آنے سے معدہ خالی اور ہلکا ہو جایا کرے گا، اور کچھ پسینے کے راستے نکلا جایا کرے گا، لیکن اس پسینہ میں بھی مشک کی سی خوشبو ہوگی، اور اس دنیا میں جس طرح آپ سے آپ ہمارے اندر سے باہر، اور باہر سے اندر سانس کی آمد و رفت ہے، جنت میں اسی طرح اللہ کا ذکر جاری ہوگا، اور سبحان اللہ والحمد للہ، یا سبحان اللہ وبحمدہ سانس کی طرح ہر دم جاری رہے گا۔

۱۲۳) **عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ یُنَادِیْ مُنَادٍ اَنَّ لَکُمْ اَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقِمُوْا اَبَدًا وَاِنَّ لَکُمْ اَنْ تَحْیَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا اَبَدًا وَّاِنَّ لَکُمْ اَنْ تَشِبُّوا فَلَا تَهْرَمُوْا اَبَدًا وَاِنَّ لَکُمْ اَنْ تَنْعِمُوْا فَلَا تَبْاَسُوْا اَبَدًا.** (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، یہ دونوں بیان فرماتے ہیں کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پکارنے والا جنت میں جنتیوں کو مخاطب کر کے پکارے گا، کہ یہاں صحت ہی تمہارا حق ہے، اور تندرستی ہی تمہارے لئے مقدر ہے، اسلئے اب تم کبھی بیمار نہ پڑوگے، اور یہاں تمہارے لئے زندگی اور حیات ہی ہے، اسلئے اب تمہیں موت کبھی نہ آئے گی، اور تمہارے واسطے جوانی اور شباب ہی ہے، اسلئے اب کبھی تمہیں بڑھاپا نہیں آئے گا، اور تمہارے واسطے یہاں چین اور عیش ہی ہے، اسلئے اب کبھی تمہیں کوئی تنگی اور تکلیف نہ ہوگی۔ (مسلم)

تشریح...... جنت صرف آرام اور راحت کا گھر ہے، اسلئے وہاں کسی تکلیف کا، اور کسی تکلیف دہ حالت کا گذر نہ ہوگا، نہ وہاں بیماری ہوگی، نہ موت آئے گی، نہ بڑھاپا کسی کو ستائے گا، نہ کسی اور قسم کی کوئی تنگی اور پریشانی کسی کو لاحق ہوگی، اور جنتی بندے جب جنت میں پہنچیں گے تو شروع ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابدی حیات اور ابدی راحت کی یہ بشارت سنا کر ان کو مطمئن کر دیا جائے گا۔

۱۲۴) **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِمَّا خُلِقَ الْخَلْقُ؟ قَالَ مِنَ الْمَاءِ قُلْنَا اَلْجَنَّةُ مَا بِنَاءُ هَا قَالَ لِبْنَةٌ مِنْ ذَهَبٍ وَلِبْنَةٌ مِنْ فِضَّةٍ وَمِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْاَذْفَرُ وَحَصْبَاءُ هَا اللُّؤْلُؤُ وَالْیَاقُوْتُ وَ تُرْبَتُهَا الزَّعْفَرَانُ مَنْ یَّدْخُلُهَا یَنْعَمُ وَلَا یَبْاَسُ وَیَخْلَدُ وَلَا یَمُوْتُ وَلَا یَبْلٰی ثِیَابُهُمْ وَلَا یَفْنٰی شَبَابُهُمْ.** (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، کہ مخلوق کس چیز سے پیدا کی گئی؟ آپ نے فرمایا پانی سے، پھر ہم نے عرض کیا، کہ جنت کس چیز سے بنی (یعنی اس کی تعمیر پتھروں سے ہوئی یا اینٹوں سے، یا کس چیز سے؟) آپ نے فرمایا، اس کی تعمیر اس طرح ہے، کہ ایک اینٹ سونے کی، اور ایک اینٹ چاندی کی، اور اس کا مسالہ (جس سے اینٹوں کو جوڑا گیا ہے) تیز خوشبودار

مشک ہے، اور وہاں کے سنگریزے جو بچھے ہوئے ہیں وہ موتی اور یاقوت ہیں، اور وہاں کی خاک گویا زعفران ہے، جو لوگ اس جنت میں پہنچیں گے، ہمیشہ عیش اور چین سے رہیں گے، اور کوئی تنگی، تکلیف، ان کو نہ ہوگی۔ اور ہمیشہ زندہ رہیں گے، وہاں ان کو موت نہیں آئے گی، اور کبھی ان کے کپڑے پرانے اور خستہ نہ ہوں گے، اور ان کی جوانی کبھی زائل نہ ہوگی۔　(مسند احمد، ترمذی، دارمی)

تشریح۔ حضرت ابوہریرہؓ کے پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ عام مخلوق پانی سے پیدا کی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی پیدا کیا، اور پھر سے اور مخلوق وجود میں آئی۔ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے: "واللہ خلق کل دآبة من مآء" اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: "وجعلنا من المآء کل شیٔ حی" جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر جاندار پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ پھر دوسرے سوال کے جواب میں جنت کی تعمیر اور وہاں کے فرش، اور وہاں کی خاک کے متعلق جو کچھ رسول اللہ نے بیان فرمایا، اس کی اصلی حقیقت اور کیفیت مشاہدے ہی سے معلوم ہوگی، البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جنت کی تعمیر اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ کسی عملے نے اسے بنایا ہو، جس طرح ہماری اس دنیا میں عمارتیں بنتی ہیں، بلکہ جنت اور اس کی ہر چیز معماروں اور صناعوں کے توسط کے بغیر اللہ کے حکم سے بنی ہے، جس طرح زمین و آسمان اور آسمان کے ستارے، آفتاب و ماہتاب وغیرہ سب براہ راست اللہ کے حکم سے بنے ہیں۔

"اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ○"

اہل جنت کے لئے حق تعالیٰ کی دائمی رضا

۱۲۵) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ یَااَهْلَ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُوْنَ لَبَّیْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ فَیَقُوْلُ هَلْ رَضِیْتُمْ؟ فَیَقُوْلُوْنَ وَمَا لَنَا لَا نَرْضٰی یَا رَبِّ وَقَدْ اَعْطَیْتَنَا مَالَمْ تُعْطِ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ فَیَقُوْلُ اَلَا اُعْطِیْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ یَا رَبِّ وَ اَیُّ شَیْءٍ اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَیَقُوْلُ اُحِلُّ عَلَیْكُمْ رِضْوَانِیْ فَلَا اَسْخَطُ عَلَیْكُمْ بَعْدَهٗ اَبَدًا. (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ، رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ (جنتی جب جنت میں پہنچ جائیں گے اور وہاں کی نعمتیں ان کو عطا ہو جائیں گی تو) اللہ تعالیٰ ان کو مخاطب کر کے فرمائیں گے، کہ اے اہل جنت! وہ عرض کریں گے، کہ اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں، حاضر ہیں، آپ کی بارگاہ قدس میں، اور ساری خیر اور سب بھلائی آپ ہی کے قبضے میں ہے (جس کو چاہیں عطا فرمائیں یا عطا نہ فرمائیں) پھر اللہ تعالیٰ ان بندوں سے فرمائیں گے، تم خوش ہو؟ (یعنی جنت اور جو نعمتیں جنت میں تم کو دی گئی، تم ان سے راضی ہو؟) یہ جنتی بندے عرض کریں گے، اے پروردگار! جب آپ نے ہمیں یہاں وہ کچھ نصیب فرمایا جو اپنی کسی مخلوق کو نہیں دیا تھا (یعنی آپ کی بخشش، اور آپ کے کرم سے جب یہاں ہمیں وہ نعمتیں اور وہ راحتیں اور لذتیں نصیب ہیں، جو دنیا میں کسی بڑے سے بڑے کو بھی نصیب نہیں تھیں) تو ہم کیوں راضی اور خوش نہ ہوں گے۔

اسکے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، کیا میں تمہیں اس سب سے اعلیٰ و افضل ایک چیز اور دوں! وہ بندے عرض کریں گے کہ خداوندا! وہ کیا چیز ہے، جو اس جنت اور اس کی ان نعمتوں سے بھی افضل ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میں تم کو اب اپنی دائمی اور ابدی رضامندی، اور خوشنودی کا تحفہ دیتا ہوں، اسکے بعد اب میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح..... جنت اور اس کی ساری نعمتیں عطا فرمانے کے بعد اس رب کریم کا اپنے بندوں سے پوچھنا، کہ "تم راضی ہو، خوش اور مطمئن ہو؟" بجائے خود کتنی بڑی نعمت ہے اور پھر دائمی رضا کا تحفہ، اور کبھی ناراض نہ ہونے کا اعلان، کتنا بڑا انعام اور احسان ہے، اس سے جو لذت اور مسرت اہلِ جنت کو اس وقت حاصل ہوگی، اگر اس کا ایک ذرہ اس دنیا میں ہم پر منکشف کر دیا جائے، تو دنیا کی کسی لذت اور مسرت کی چاہت ہمارے دلوں میں نہ رہے، بیشک اللہ کی رضا، جنت اور اسکی ساری نعمتوں سے بہت ہی اعلیٰ و بالا ہے، "ورضوانٌ من اللہ اکبر" اور لذت و مسرت میں اعلان رضا سے بڑھ کر صرف "دیدار الٰہی ہے"۔

جنت میں دیدارِ الٰہی

حق تعالیٰ کا دیدار وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے اہل جنت کو نوازا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ نے جن کو عقلِ صحیح اور ذوقِ سلیم عطا کیا ہے، وہ اگر خود اپنے وجدان میں غور کریں، تو اس نعمت کی خواہش اور تمنا وہ ضرور اپنے میں پائیں گے، اور کیوں نہ ہو جو بندہ اپنے خالق اور رب کی بے شمار نعمتیں اس دنیا میں پا رہا ہے، اور پھر جنت میں پہنچ کر اس سے لاکھوں گنی نعمتیں پائے گا، لازماً اسکے دل میں یہ تمنا اور تڑپ پیدا ہوگی کہ کسی طرح میں اپنے اس محسن اور کریم رب کو دیکھ پاتا، جس نے مجھے وجود بخشا، اور جو اس طرح مجھ پر اپنی نعمتیں انڈیل رہا ہے۔ پس اگر اسے کبھی بھی یہ نظارہ نصیب نہ ہو، تو یقیناً اس کی لذت و مسرت اور اسکے عیش میں بڑی تشنگی رہے گی، اور اللہ تعالیٰ جس بندہ سے راضی ہو کر اس کو جنت میں پہنچائیں گے اس کو ہرگز ایسے تشنہ اور محروم نہیں رکھیں گے۔

اہل ایمان کے لئے قرآن مجید میں بھی اس نعمتِ عظمیٰ کی بشارت سنائی گئی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں صاف صاف اس کی خوش خبری دی ہے، اور تمام اہل ایمان نے بغیر کسی تردد کے اس پر یقین کیا ہے، لیکن بعض ایسے طبقے، اور ایسے لوگ جو آخرت کی چیزوں کو بھی اس دنیا کے انداز سے سوچتے ہیں، اور یہاں کے اپنے محدود علم و تجربے کو، علم و تجربے کا آخری اور انتہائی درجہ سمجھتے ہیں، انہیں اس مسئلہ میں شبہات پیش آتے ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ دیکھا تو اس چیز کو جا سکتا ہے جو جسم ہو، اور اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے، نہ اس کا کوئی رنگ ہے، اور نہ اس کے لئے آگے یا پیچھے کی کوئی جہت ہے، تو پھر اسکو دیکھا کیونکر جا سکتا ہے! حالانکہ یہ سراسر مغالطہ ہے، اگر اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہوتا، کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا کی انہی آنکھوں سے ہوگا، جو صرف جسم کی، اور کسی رنگ دار چیز ہی کو دیکھ سکتی ہیں، اور جن کی بینائی صرف اس چیز کا ادراک کر سکتی ہے، جو انکی سیدھ میں، یعنی سامنے ہو، تو بیشک ان منکرین کا یہ سوچنا کسی درجہ میں صحیح ہوتا، لیکن نہ

قرآن وحدیث نے یہ بتلایا ہے، اور نہ اہلِ حق کا یہ عقیدہ ہے۔

اہلِ حق، اہل السنۃ والجماعۃ جو قرآن وحدیث کے اتباع میں اسکے قائل ہیں، کہ جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار ان بندوں کو نصیب ہوگا جو اس نعمت عظمیٰ کے مستحق ہوں گے، وہ اسکے بھی قائل ہیں، کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو بہت سی ایسی قوتیں عطا فرمائیں گے، جو اس دنیا میں کسی کو عطا نہیں ہوئیں، اور انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایسی آنکھیں عطا ہوں گی، جن کی بینائی کی قوت اتنی محدود اور کمزور نہ ہوگی، جتنی کہ اس دنیا میں ہماری آنکھوں کی ہے، اور ان ہی آنکھوں سے اہلِ جنت کو اپنے اس رب قدوس کا دیدار نصیب ہوگا، جو نہ جسم ہے، نہ اسکا کوئی رنگ ہے، اور نہ اس کے لئے کوئی جہت ہے، بلکہ وہ ان سب چیزوں سے وراء الوراء ہے، وہ نور ہے، سراسر نور ہے اور سارے انوار کا سرچشمہ ہے۔

اس توضیح کے بعد بھی رؤیتِ باری کے مسئلہ میں جن لوگوں کو عقلی استحالہ کا وسوسہ ہو، انہیں ذرا دیر کے لئے اس پر غور کرنا چاہئے، کہ اپنی مخلوقات کو اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا ہے، یا نہیں؟ اگر دیکھنا صرف ان ہی ذرائع سے، اور ان ہی شرائط کے ساتھ ہو سکتا ہے جن سے ہم دیکھتے ہیں، تو پھر تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بھی کسی کو نہ دیکھ سکتا ہو، کیونکہ نہ اس کی آنکھ ہے، اور نہ کوئی مخلوق اس کی نسبت سے کسی جہت میں ہے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے بغیر دیکھتا ہے، اور ہماری آنکھیں جن چیزوں کو کسی طرح، اور کسی حال نہیں دیکھ سکتیں، وہ ان کو بھی دیکھتا ہے اور بغیر مقابلہ اور جہت کے دیکھتا ہے، انہیں رؤیتِ باری کے مسئلہ میں بھی اس قسم کا کوئی وسوسہ نہ ہونا چاہئے، اور اللہ ورسول کی اطلاعات اور بشارات پر یقین کرتے ہوئے سمجھ لینا چاہئے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور رحمت سے ایسی آنکھیں نصیب فرمائیں گے، جو حق تعالیٰ شانہ کے جمال کے نظارہ کی لذت بھی حاصل کر سکیں گی۔

قرآن پاک میں اہلِ ایمان کو بشارت سنائی گئی ہے، کہ: "وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (مطلب یہ ہے، کہ اہلِ جنت کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، وہ خوش وخرم اور شاد ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے)۔ اور اسکے بالمقابل دوسرے موقع پر مکذبین اور منکرین کے بارے میں فرمایا گیا ہے "إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ" (یعنی یہ بدنصیب لوگ اس دن اپنے رب سے روک دیئے جائیں گے، اس کی زیارت اور اس کی دید سے محروم رکھے جائیں گے)۔

جنت میں حق تعالیٰ کی رؤیت سے متعلق رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث مروی ہیں، وہ سب مل کر حد تواتر کو پہنچ جاتی ہیں، اور ایک مؤمن کے یقین کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے صرف چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں:

۱۲۶) **عَنْ صُهَيْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ يَقُوْلُ اللهُ تَعَالٰى أَتُرِيْدُوْنَ شَيْئًا اَزِيْدُكُمْ ؟ فَيَقُوْلُوْنَ اَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا اَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ، قَالَ فَيَرْفَعُ الْحِجَابُ فَيَنْظُرُوْنَ اِلٰى وَجْهِ اللهِ فَمَا اُعْطُوْا شَيْئًا اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنَ النَّظْرِ اِلٰى رَبِّهِمْ ثُمَّ تَلَا "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ".** (رواہ مسلم)

حضرت صُہیبؓ رومی سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرمائیں گے، کیا تم چاہتے ہو میں تم کو ایک چیز مزید عطا کروں؟ (یعنی تم کو جو کچھ اب تک عطا ہوا، اس پر مزید اور اس سے سوا ایک خاص چیز اور عنایت کروں)۔ وہ بندے عرض کریں گے، آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے (یعنی سرخروئی اور خوبروئی عطا فرمائی) اور دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کیا (اب اسکے آگے اور کیا چیز ہو سکتی ہے جس کی ہم خواہش کریں)۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان بندوں کے اس جواب کے بعد یکایک حجاب اٹھ جائے گا (یعنی ان کا آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا جائے گا) پس وہ روئے حق، اور جمالِ الٰہی کو بے پردہ دیکھیں گے، پس ان کا حال یہ ہوگا (اور وہ محسوس کریں گے) کہ جو کچھ اب تک انہیں ملا تھا، اس سب سے زیادہ محبوب اور پیاری چیز ان کے لئے یہی دیدار کی نعمت ہے، یہ بیان فرما کے آپ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی: "لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ" (جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھی بندگی والی زندگی گزاری، ان کے لئے اچھی جگہ ہے (یعنی جنت وما فیہا) اور اس پر مزید ایک نعمت (یعنی دیدارِ حق)۔

تشریح ..... آنکھوں سے پردہ اٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دفعتہً ان کی آنکھوں کو بینائی کی ایسی طاقت عطا فرما دے گا، کہ وہ روئے حق کا نظارہ کر سکیں گی۔ واللہ اعلم۔

رسول اللہ ﷺ نے آخر میں جو آیت تلاوت فرمائی، اسکے ذریعہ یہ بتلایا ہے کہ اس آیت میں "زیادۃ" سے مراد حق تعالیٰ کے دیدار کی نعمت ہے، جو جنت اور نعمائے جنت کے علاوہ اور ان سے سوا ہے۔

۱۲۷) عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَنَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ، ثُمَّ قَرَأَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا. (رواه البخاری ومسلم)

جریر بن عبد اللہ بجلی سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ (ایک رات کو) ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے چاند کی طرف دیکھا، اور یہ چودھویں رات تھی (اور چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ، اور بھرپور نکلا ہوا تھا) پھر آپ نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا، کہ: "یقیناً تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے، جیسے کہ اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اسکے دیکھنے میں کوئی کشمکش نہیں کرنی پڑے گی، اور کوئی زحمت نہ ہوگی، پس اگر تم یہ کر سکو، کہ طلوعِ آفتاب سے پہلی نماز، اور غروبِ آفتاب سے پہلی والی نماز کے مقابلے میں کوئی چیز کبھی تم پر غالب نہ آئے (یعنی کوئی مشغلہ اور کوئی دلچسپی اور آرام طلبی ان نمازوں کے وقت میں تمہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے) تو لازماً ایسا کرو (پھر انشاء اللہ دیدارِ حق اور نظارۂ جمالِ الٰہی کی نعمت ضرور تم کو نصیب ہوگی)۔ اسکے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا"۔ (اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اسکی تسبیح کرو (یعنی اس کی تعریف بیان کرنے کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو) سورج کے

نکلنے سے پہلے، اور اسکے ڈوبنے سے پہلے)۔ [illegible]

تشریح دنیا میں جب کسی حسین و جمیل چیز کے دیکھنے والے لاکھوں کروڑوں جمع ہو جائیں اور سب اسکے دیکھنے کے انتہائی درجہ میں مشتاق ہوں، تو ایسے موقعوں پر عموماً بڑی کشمکش اور بڑی زحمت ہوتی ہے، اور اس چیز کو اچھی طرح دیکھنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن چاند کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو مشرق و مغرب کے آدمی بغیر کسی کشمکش اور زحمت کے، اور پورے اطمینان سے بیک وقت دیکھ سکتے ہیں، اسلئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی مثال سے سمجھایا، کہ جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار اسی طرح بیک وقت اسکے بے شمار خوش نصیب بندوں کو نصیب ہوگا، اور کسی کو کشمکش اور زحمت سے سابقہ نہیں پڑے گا، سب کی آنکھیں بڑے سکون و اطمینان سے وہاں جمالِ حق کے نظارہ کی لذت حاصل کریں گی۔ اللّٰھم اجعلنا منھم۔

آخر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے عمل کی طرف بھی توجہ دلائی جو بندہ کو اس نعمت (دیدارِ حق) کا مستحق بنانے میں خاص اثر رکھتا ہے، یعنی فجر و عصر کی نمازوں کا خصوصیت سے ایسا اہتمام، کہ کوئی مشغولیت اور کوئی دلچسپی ان نمازوں کے وقت میں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، اگرچہ فرض تو پانچ نمازیں ہیں، لیکن نصوص کتاب و سنت ہی سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان دو نمازوں کو خاص اہمیت اور فضیلت حاصل ہے، رسول اللہ ﷺ نے قرآنی آیت "وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها" پڑھ کر، ان دو نمازوں کی اسی خصوصیت اور فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۱۲۸) **عَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ الْعُقَیْلِیْ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللہِ اَکُلُّنَا یَرٰی رَبَّہٗ مُخْلِیًا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ قَالَ بَلٰی قُلْتُ وَمَا آیَۃُ ذَالِكَ؟ قَالَ یَا اَبَا رَزِیْنٍ اَلَیْسَ کُلُّکُمْ یَرَی الْقَمَرَ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ مُخْلِیًا بِہٖ قَالَ بَلٰی قَالَ فَاِنَّمَا ھُوَ خَلْقٌ مِنْ خَلْقِ اللہِ وَاللہُ اَجَلُّ وَ اَعْظَمُ۔** (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ ابورزین عقیلی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا قیامت میں ہم میں سے ہر ایک اپنے رب کو اکیلا (بغیر بھیڑ بھاڑ اور کشمکش کے) دیکھ سکے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں! دیکھ سکے گا، میں نے عرض کیا اور کیا اس کی کوئی نشانی اور مثال (ہماری اس دنیا میں بھی ہے) آپ نے فرمایا اے ابورزین! کیا چودھویں رات کو تم میں سے ہر ایک چاند کو بجائے خود اور اکیلا بغیر بھیڑ بھاڑ کے نہیں دیکھتا؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں بے شک چاند کو تو ہم سب ہی اسی طرح دیکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تو اللہ کی مخلوق ہے، اور اللہ تو بڑی جلالت والا اور نہایت عظمت والا ہے (پھر اس کے لئے کیا چیز مشکل ہے)۔ [illegible]

اللّٰھُمَّ انّا نسئلك لذۃ النظر الی وجھك والشوق الی لقائك۔

دوزخ اور اس کا عذاب

جس طرح جنت کے متعلق قرآن پاک کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اعلیٰ درجے کی ایسی لذتیں اور راحتیں ہیں، کہ دنیا کی بڑی سے بڑی لذتوں اور راحتوں کو ان سے کوئی

نسبت نہیں، اور پھر وہ سب ابدی اور غیر فانی ہیں، اسی طرح دوزخ کے متعلق قرآن وحدیث میں جو کچھ بتلایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایسی تکلیفیں اور ایسے دکھ ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے دکھوں اور بڑی سے بڑی تکلیفوں کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے الفاظ سے جنت کے عیش وراحت اور دوزخ کے دُکھ اور عذاب کا جو تصور اور جو نقشہ ہمارے ذہنوں میں قائم ہوتا ہے وہ بھی اصل حقیقت سے بہت ناقص اور کمتر ہے، اور یہ اسلئے کہ ہماری زبان کے سارے الفاظ ہماری اسی دنیا کی چیزوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مثلاً سیب یا انگور کے لفظوں سے ہمارا ذہن بس اسی قسم کے سیبوں یا انگوروں کی طرف جا سکتا ہے جن کو ہم نے دیکھا اور چکھا ہے ہم جنت کے ان سیبوں اور انگوروں کی اصل حقیقت اور کیفیت کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔ جو اپنی خوبیوں میں یہاں کے سیبوں اور انگوروں سے ہزاروں درجہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں گے، اور جن کا کوئی نمونہ ہم نے یہاں نہیں دیکھا۔ اسی طرح مثلاً سانپ اور بچھو کے لفظ سے ہمارا ذہن اسی قسم کے سانپوں اور بچھوؤں کی طرف جا سکتا ہے جو ہم نے اس دنیا میں دیکھے ہیں، دوزخ کے ان سانپوں اور بچھوؤں کا پورا نقشہ ہمارے ذہنوں میں کیسے آسکتا ہے جو اپنی جسامت اور خوف ناکی اور زہریلے پن میں یہاں کے ان سانپوں اور بچھوؤں سے ہزاروں درجہ بڑھے ہوئے ہوں گے، اور کبھی ہم نے ان کی تصویر تک نہیں دیکھی ہے۔

بہر حال قرآن وحدیث کے الفاظ سے بھی جنت ودوزخ کی چیزوں کی اصل کیفیت، اور اصل حقیقت کو ہم یہاں پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے، بس وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگا، کہ جنت کے عیش وراحت کے بارے میں جو کچھ ہم نے جانا اور سمجھا تھا، ہمارا وہ علم بڑا ہی ناقص تھا، اور جنت میں تو اس سے ہزاروں درجہ عیش و راحت ہے، اور دوزخ کے دکھ اور عذاب کے بارہ میں جو کچھ ہم نے سمجھا تھا اصل حقیقت کے مقابلے میں وہ بھی بہت ہی ناقص تھا، اور یہاں تو ہمارے سمجھے ہوئے سے ہزاروں گنا زیادہ دکھ اور عذاب ہے۔

اور جیسا کہ اس سے پہلے جنت کے بیان میں بتلایا جا چکا ہے، دوزخ اور جنت کے متعلق جو کچھ قرآن و حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اس کا یہ مقصد ہے ہی نہیں، کہ جو کچھ وہاں پر پیش آنے والا ہے، اسکو ہم یہاں پوری طرح سمجھ لیں اور جان لیں، اور وہاں کے حالات کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے آجائے، بلکہ اس بیان کا اصل مقصد تبشیر اور انذار ہے، یعنی جنت کا شوق اور دوزخ کا خوف دلا کر اللہ کی رضا والی اور دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچانے والی زندگی پر اللہ کے بندوں کو آمادہ کرنا، اور اس مقصد کے لئے جنت ودوزخ سے متعلق قرآن وحدیث کا یہ بیان بالکل کافی ہے، پس اس سلسلے کی آیات واحادیث پر غور کرتے وقت ہمیں اسی خاص مقصد کو سامنے رکھنا چاہیے۔

۱۲۹) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ نَارُكُمْ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِيْنَ جُزْاً مِنْ نَّارِ جَهَنَّمَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً قَالَ فُضِّلَتْ عَلَيْهِنَّ بِتِسْعَةٍ وَّ سِتِّيْنَ جُزْاً كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا.

(رواہ البخاری ومسلم واللفظ للبخاری)

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تمہاری اس دنیا کی آگ دوزخ کی آگ کے ستر

حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہی (دنیا کی آگ) کافی تھی؟ آپ نے فرمایا: "دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں انہتر (۶۹) درجہ بڑھادی گئی ہے، اور ہر درجہ کی حرارت آتش دنیا کی حرارت کے برابر ہے۔"

تشریح..... اس دنیا کی آگ کی قسموں میں بھی درجۂ حرارت میں بعض بعض سے بہت بڑھی ہوئی ہیں، مثلاً لکڑی کی آگ میں گھاس پھونس کی آگ سے زیادہ گرمی ہوتی ہے اور مثلاً پتھر کے کوئلے کی آگ میں لکڑی کی آگ کے مقابلے میں بہت زیادہ حرارت ہوتی ہے اور بعض بموں سے جو آگ پیدا ہوتی ہے، وہ درجۂ حرارت میں ان سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور اب تو آلات سے معلوم کرنا بھی آسان ہو گیا ہے کہ ایک آگ دوسری آگ کے مقابلہ میں کتنے درجہ کم یا زیادہ گرم ہے، پس اب حدیث کے اس مضمون کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا، کہ "دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں ستر درجہ زیادہ حرارت اپنے اندر رکھتی ہے"۔

اور جیسا کہ پہلے بھی کئی بار شرح حدیث کے اسی سلسلہ میں بتلایا گیا ہے کہ عربی زبان میں ایسے موقعوں پر ستر کا عدد کسی چیز کی صرف زیادتی اور کثرت ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، پس ہو سکتا ہے، کہ اس حدیث میں بھی یہ عدد اسی محاورے کے مطابق استعمال کیا گیا ہو، اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہو گا کہ دوزخ کی آگ اپنی گرمی، اور جلانے کی صفت میں دنیا کی آگ سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب دوزخ کی آگ کا یہ حال بیان فرمایا تو کسی صحابی نے عرض کیا، کہ یا رسول اللہ! دنیا کی آگ کی حرارت ہی کافی تھی اس پر آپ نے اور زیادہ واضح لفظوں میں پھر پہلے ہی مضمون کو دہرایا، اسکے علاوہ کوئی اور جواب نہیں دیا، غالباً اس طریق جواب سے آپ نے اس پر متنبہ فرمایا، کہ ہمیں اللہ کے افعال اور اسکے فیصلوں کے بارے میں ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں، جو کچھ اس نے کیا ہے، اور جو کچھ وہ کرے گا، وہی ٹھیک ہے۔

۱۳۰) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَنْ لَهُ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ مَا يَرٰى اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَّاِنَّهُ لَاَ هْوَ نُهُمْ عَذَابًا. (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا وہ شخص ہو گا، جسکی چپلیں اور ان چپلوں کے تسمے آگ کے ہوں گے، انکی گرمی سے اسکا دماغ اسطرح کھولے گا اور جوش مارے گا، کہ جس طرح چولہے پر دیگچی کھولتی ہے۔ اور اس میں جوش آتا ہے وہ نہیں خیال کرے گا، کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سخت عذاب میں بھی ہے (یعنی وہ اپنے ہی کو سب سے زیادہ سخت عذاب میں سمجھے گا) حالانکہ وہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا ہو گا۔

۱۳۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُؤْتٰى بِاَنْعَمِ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُصْبَغُ

فِي النَّارِ صِبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّبِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ لَا وَاللهِ يَا رَبِّ! وَيُؤْتٰى بِاَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ وَهَلْ مَرَّبِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ لَا وَاللهِ يَا رَبِّ مَا مَرَّ بِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے (یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنے کفر و شرک کی وجہ سے یا فسق و فجور کی وجہ سے دوزخ میں جانے والے ہوں گے) ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جس نے اپنی دنیا کی زندگی نہایت عیش و آرام کے ساتھ گزاری ہوگی، اور پھر اس کو دوزخ کی آگ میں ایک غوطہ دلایا جائے گا (یعنی جس طرح کپڑے کو رنگتے وقت رنگ میں ڈال کر اور بس ایک ڈوب دے کر نکال لیتے ہیں، اسی طرح اس شخص کو دوزخ کی آگ میں ڈال کر فوراً نکال لیا جائے گا) پھر اس سے کہا جائے گا، کہ آدم کے فرزند! کیا تو نے کبھی خیریت اور اچھی حالت بھی دیکھی ہے، اور کیا کبھی عیش و آرام کا کوئی دور تجھ پر گذرا ہے؟ وہ کہے گا کبھی نہیں، قسم خدا کی اے پروردگار! اور ایک شخص اہل جنت میں سے (یعنی ان خوش نصیب بندوں میں سے جو اپنی ایمان والی زندگی کی وجہ سے جنت کے مستحق ہوں گے) ایسا لایا جائے گا جسکی زندگی دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف میں اور دکھ میں گزری ہوگی، اور اسکو ایک غوطہ جنت میں دیا جائے گا (یعنی جنت کی فضاؤں اور ہواؤں میں پہنچا کر فوراً نکال لیا جائے گا) اور اس سے کہا جائے گا، کہ اے آدم کے فرزند! کیا کبھی تو نے کوئی دکھ دیکھا۔ اور کیا تجھ پر کوئی دور شدت اور تکلیف کا گزرا ہے، پس وہ کہے گا نہیں، خدا کی قسم اے میرے پروردگار! مجھ پر کبھی کوئی تکلیف نہیں گذری، اور میں نے کبھی کسی تکلیف کا منہ نہیں دیکھا!

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ دوزخ کا عذاب اتنا سخت ہے کہ اس کا ایک لمحہ عمر بھر کے عیش و راحت کو بھلا دے گا، اور جنت میں وہ راحت اور عیش ہے کہ اس میں قدم رکھتے ہی آدمی عمر بھر کے سارے دکھ اور ساری کلفتیں بھول جائے گا۔

۱۳۲) **عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مِنْهُمْ مَنْ تَاخُذُهُ النَّارُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاخُذُهُ النَّارُ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاخُذُهُ النَّارُ اِلٰى حُجْزَتِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاخُذُهُ النَّارُ اِلٰى تَرْقُوَتِهِ.**

(رواہ مسلم)

ترجمہ سمرہ بن جندب سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سے بعض وہ ہوں گے کہ جن کو پکڑے گی آگ ان کے ٹخنوں تک، اور بعض وہ ہوں گے کہ جن کو پکڑے گی آگ ان کے زانوؤں تک، اور بعض وہ ہوں گے جن کو پکڑے گی آگ ان کی کمر تک، اور بعض وہ ہوں گے جن کو پکڑے گی آگ ان کی ہنسلی تک۔

تشریح..... حدیث کا مقصد یہ ہے کہ دوزخ میں سب ایک درجہ میں اور ایک ہی حال میں نہیں ہوں گے، بلکہ جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے عذاب میں کمی بیشی ہوگی، مثلاً کچھ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ آگ ان

کے صرف ٹخنوں تک پہنچے گی، اور کچھ لوگوں پر عذاب اس سے زیادہ ہوگا، اور آگ ان کے زانوؤں تک پہنچے گی، اور کچھ لوگوں پر اس سے بھی زیادہ ہوگا، اور آگ ان کی کمر تک پہنچا کرے گی، اور کچھ لوگ ان سے بھی سخت تر اور بد تر حالت میں رہیں گے اور آگ ان کی گردن تک پہنچے گی۔ اللّٰهم احفظنا

۱۳۳) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ فِی النَّارِ حَیَّاتٍ کَاَمْثَالِ الْبُخْتِ تَلْسَعُ اِحْدَاهُنَّ اللَّسْعَةَ فَیَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا وَاِنَّ فِی النَّارِ عَقَارِبَ کَاَمْثَالِ الْبِغَالِ الْمُوْکَفَةِ تَلْسَعُ اِحْدَاهُنَّ اللَّسْعَةَ فَیَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا۔ (رواه احمد)

عبداللہ بن الحارث سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: جہنم میں سانپ ہیں، جو اپنی جسامت میں بختی اونٹوں کے برابر ہیں (جو جثہ میں عام اونٹوں سے بھی بڑے ہوتے ہیں) اور وہ اس قدر زہریلے ہیں کہ ان میں کا کوئی سانپ جس دوزخی کو ایک دفعہ ڈسے گا، تو چالیس سال کی مدت تک وہ اسکے زہر کا اثر پائے گا (اور تڑپے گا) اور اسی طرح دوزخ میں بچھو ہیں، جو (اپنی جسامت میں) پالان بندھے خچروں کی مانند ہیں (وہ بھی ایسے ہی زہریلے ہیں کہ) ان میں سے کوئی کسی دوزخی کو ایک دفعہ ڈنک مارے گا، تو چالیس سال تک وہ اسکے زہر کی تکلیف پائے گا۔

۱۳۴) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ اَنَّ دَلْوًا مِنْ غَسَّاقٍ یُهْرَاقُ فِی الدُّنْیَا لَاَنْتَنَ اَهْلَ الدُّنْیَا۔ (رواه الترمذی)

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: "غساق (یعنی وہ سڑی ہوئی پیپ جو جہنمیوں کے زخموں سے نکلے گی اور جس کے متعلق قرآن مجید میں بتلایا گیا ہے کہ وہی انتہائی بھوک میں ان کی غذا ہوگی، وہ اس قدر بدبودار ہوگی کہ) اگر اس کا ایک ڈول اس دنیا پر بہا دیا جائے، تو ساری دنیا (اس کی سڑاہند سے) بدبودار ہو جائے۔

۱۳۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَرَءَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ اَنَّ قَطْرَةً مِنَ الزَّقُّوْمِ قَطَرَتْ فِیْ دَارِ الدُّنْیَا لَاَفْسَدَتْ عَلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ مَعَایِشَهُمْ فَکَیْفَ بِمَنْ یَکُوْنُ طَعَامُهٗ۔ (رواه الترمذی)

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اتقوا اللہ حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔ (اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور فیصلہ کر لو کہ ہرگز نہ مروگے، مگر اس حال میں کہ تم مسلم (اللہ کے فرمانبردار بندے) ہوگے) (اور اللہ سے اسکے عذاب سے ڈرنے کے سلسلے میں) آپ نے بیان فرمایا کہ زقوم (جس کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ وہ جہنم میں پیدا ہونے والا ایک درخت ہے، اور وہ دوزخیوں کی خوراک بنے گا) اگر اس کا ایک قطرہ اس دنیا میں ٹپک جائے، تو زمین پر بسنے والوں کے سارے سامان زندگی کو خراب کر دے، پس کیا گزرے گی اس شخص پر جس کا کھانا وہی زقوم ہوگا۔

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ زقوم اس قدر گندی اور زہریلی چیز ہے، کہ اگر اس کا ایک قطرہ ہماری اس دنیا میں ٹپک جائے تو یہاں کی تمام چیزیں اس کی بدبو اور گندگی اور زہریلے پن سے متاثر ہو جائیں، اور ہمارے کھانے پینے کی ساری چیزیں خراب ہو جائیں، پس سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ زقوم جس کو کھانا پڑے گا اس پر کیا گزرے گی۔

۱۳۶) عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ ابْكُوْا فَاِنْ لَمْ تَسْتَطِيْعُوْا فَتَبَاكُوْا فَاِنَّ اَهْلَ النَّارِ يَبْكُوْنَ فِي النَّارِ حَتّٰى تَسِيْلَ دُمُوْعُهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ كَاَنَّهَا جَدَاوِلُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الدُّمُوْعُ فَتَسِيْلَ الدِّمَاءُ فَتَقْرَحُ الْعُيُوْنُ فَلَوْ اَنَّ سُفُنًا اُزْجِيَتْ فِيْهَا لَجَرَتْ. (رواه البغوى فى شرح السنه)

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (اپنے ایک خطاب میں) فرمایا کہ: اے لوگو (اللہ اور اسکے عذاب کے خوف سے) خوب روؤ، اور اگر تم یہ نہ کر سکو، یعنی اگر حقیقی گریہ کی کیفیت تم پر طاری نہ ہو (کیونکہ وہ ایسی اختیاری چیز نہیں ہے کہ آدمی جب چاہے اس کو اپنے اندر پیدا کر سکے) تو پھر (اللہ کے قہر اور اسکے عذاب کا خیال کر کے) تکلف سے روؤ، اور رونے کی شکل بناؤ، کیونکہ دوزخی دوزخ میں اتنا روئیں گے کہ انکے چہروں پر انکے آنسو ایسے بہیں گے، کہ گویا وہ (بہتی ہوئی) نالیاں ہیں، یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے، اور پھر (آنسوؤں کی جگہ) خون بہے گا اور پھر (اس خون بہنے سے) آنکھوں میں زخم پڑ جائیں گے (اور پھر ان زخموں سے اور زیادہ خون جاری ہو گا، اور ان دوزخیوں کے ان آنسوؤں اور خونوں کی مجموعی مقدار اتنی ہو گی کہ اگر کشتیاں اس میں چلائی جائیں تو خوب چلیں۔

تشریح..... حدیث کا مقصد یہ ہے کہ دوزخ میں اتنا دکھ اور ایسا عذاب ہو گا، کہ آنکھیں آنسوؤں کا ذخیرہ ختم کر کے خون روئیں گی، اور اس مسلسل رونے سے ان میں زخم پڑ جائیں گے، پس وہاں کے اس دکھ اور عذاب سے، اور آنسوؤں کا اور خون کا دریا بہانے والے اس رونے سے بچنے کے لئے آدمیوں کو چاہئے، کہ وہ یہاں اپنے اندر خدا کا خوف پیدا کریں، اور روئیں، دوسری ایک حدیث میں ہے کہ "لا يلج النار من بكى من خشية الله حتى يعود اللبن فى الضرع"[1] (یعنی جو یہاں اللہ کے خوف سے روئے گا، وہ ہرگز دوزخ میں نہیں جائے گا) بہر حال اللہ کے خوف سے رونا اور اگر رونا نہ آئے، تو رونے کی صورت ہی بنانا، اللہ کے رحم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خاص ذریعہ ہے، اور دوزخ کے عذاب سے بچانے والے خاص اعمال میں سے ہے۔

۱۳۷) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ فَمَا زَالَ يَقُوْلُهَا حَتّٰى لَوْ قَامَ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا سَمِعَهُ اَهْلُ السُّوْقِ وَحَتّٰى سَقَطَتْ خَمِيْصَةٌ كَانَتْ عَلَيْهِ عِنْدَ رِجْلَيْهِ. (رواه الدارمى)

ترجمہ نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ (اپنے ایک خطاب میں) فرماتے تھے: میں نے تمہیں آتش دوزخ سے خبردار کر دیا ہے، میں نے تمہیں دوزخ کے عذاب سے آگاہ

---

[1] رواہ الترمذی والنسائی عن ابی ہریرۃ۔

کردیا ہے۔ آپ یہی کلمہ بار بار فرماتے تھے (آگے حدیث کے راوی نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ آپ یہ بات اتنی بلند آواز سے فرماتے) کہ اگر آپ اس جگہ ہوتے جہاں پر اس وقت میں ہوں (اور یہاں سے فرماتے) تو بازار والے بھی آپ کے اس ارشاد کو سن لیتے، اور (اس وقت آپ پر خود فراموشی کی ایک خاص کیفیت طاری تھی) یہاں تک کہ آپ کی کملی جو اس وقت آپ اوڑھے ہوئے تھے، آپ کے قدموں کے پاس آ گری۔ [illegible]

تشریح..... بعض خطابات کے وقت حضور کی کوئی خاص کیفیت ہوتی تھی، صحابۂ کرامؓ اس کی کوشش فرماتے تھے کہ ان خطابات کی روایت کے وقت اس خاص کیفیت کو بھی کسی طرح نقل کردیں، چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر نے اس حدیث کے بیان میں جو اتنی تفصیل کی تو اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ کہ لوگوں کو یہ بات بتلادیں کہ اس خطاب کے وقت آپ کی یہ خاص حالت تھی، اور دوسروں کو دوزخ سے ڈراتے ہوئے آپ خود اتنے متاثر ہوتے تھے۔

جنت اور دوزخ کے بارے میں ایک اہم انتباہ

۱۳۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ.
(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "دوزخ شہوات ولذات سے گھیر دی گئی ہے اور جنت سختیوں اور مشقتوں سے گھری ہوئی ہے"۔ [illegible]

تشریح..... مطلب یہ ہے کہ معاصی، یعنی جو اعمال انسان کو دوزخ میں پہنچانے والے ہیں، ان میں عموماً نفس کی شہوت ولذت کا بڑا سامان ہے، اور طاعات یعنی جو اعمال انسان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہیں وہ عموماً نفس انسانی کے لئے شاق اور گراں ہیں پس جو شخص نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر معاصی کا ارتکاب کرے گا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا، اور اللہ کا جو بندہ اللہ کی فرمانبرداری کی مشقتوں کو برداشت کرے گا، اور خواہشات والی [illegible] زندگی کے بجائے احکام الٰہی کی اطاعت والی مجاہدہ کی زندگی گزارے گا، وہ جنت میں اپنا مقام حاصل کرلے گا۔ اس سے اگلی حدیث میں اسی حقیقت کو ایک اور عنوان سے، اور کسی قدر تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

۱۳۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللهُ الْجَنَّةَ قَالَ لِجِبْرَئِیْلَ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَیْهَا فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَیْهَا وَاِلٰی مَا اَعَدَّ اللهُ لِاَهْلِهَا فِیْهَا ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ اَیْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا یَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا ثُمَّ حَفَّهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ لِجِبْرَئِیْلَ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَیْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَیْهَا ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ، اَیْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِیْتُ اَنْ لَا یَدْخُلَهَا اَحَدٌ قَالَ فَلَمَّا خَلَقَ اللهُ النَّارَ قَالَ یَا جِبْرَئِیْلُ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَیْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَیْهَا ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ، اَیْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا یَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ فَیَدْخُلُهَا فَحَفَّهَا بِالشَّهَوَاتِ ثُمَّ قَالَ یَا جِبْرَئِیْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ

اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا فَقَالَ، اَىْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَا يَبْقٰى اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا۔ (رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: جب اللہ نے جنت کو بنایا، تو اپنے مقرب فرشتے جبرئیل سے فرمایا کہ تم جاؤ اور اس کو دیکھو (کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا ہے، اور اس میں کیسی کیسی نعمتیں پیدا کیں ہیں) چنانچہ وہ گئے، اور انہوں نے جا کر جنت کو اور راحت و لذت کے ان سامانوں کو دیکھا، جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس میں تیار کئے ہیں، اور پھر حق تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، کہ خداوندا! آپ کی عزت و عظمت کی قسم (آپ نے تو جنت کو ایسا حسین بنایا ہے اور اس میں راحت و لذت کے ایسے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ) جو کوئی بھی اس کا حال سن پائے گا، وہ اس میں ضرور پہنچے گا (یعنی اس کا حال سن کر وہ دل و جان سے اس کا طالب بن جائے گا، اور پھر اس میں پہنچنے کیلئے جو اچھے اعمال کرنے چاہئیں، وہ پوری مستعدی کے ساتھ وہی اعمال کرے گا، اور جن برے کاموں سے بچنا چاہئے ان سے پوری طرح بچے گا اور اس طرح اس میں پہنچ ہی جائے گا) پھر اللہ تعالیٰ نے اس جنت کو سختیوں اور مشقتوں سے گھیر دیا (یعنی جنت کے گرد شرعی احکام کی پابندی کا باڑہ لگا دیا، جو طبیعت اور نفس کے لئے بہت شاق اور گراں ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں پہنچنے کے لئے احکام کی اطاعت کی گھاٹی کو عبور کرنے کی شرط لگا دی، جس میں طبیعتوں کو اور نفسوں کو بڑی سختی اور دشواری محسوس ہوتی ہے) اور پھر جبرئیل سے فرمایا، کہ اب پھر جاؤ، اور پھر اس جنت کو (اور اس کے گرداگرد لگائی ہوئی باڑہ کو) دیکھو۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ پھر گئے، اور جا کر پھر جنت کو دیکھا اور اس مرتبہ آ کر فرمایا کہ: خداوندا قسم آپ کی عزت و عظمت کی، اب تو مجھے یہ ڈر ہے کہ اس میں کوئی بھی نہ جا سکے گا (مطلب یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے شرعی احکام کی پابندی کی گھاٹی کو عبور کرنے کی جو شرط آپ کی طرف سے لگائی گئی ہے، وہ نفس اور نفسانی خواہشات رکھنے والے انسان کے لئے اتنی شاق، اور اس قدر دشوار ہے کہ اس کو کوئی بھی پورا نہ کر سکے گا، اسلئے مجھے ڈر ہے کہ اب اس جنت کو شاید کوئی بھی حاصل نہ کر سکے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے جب دوزخ کو بنایا تو پھر جبرئیل سے فرمایا کہ: جاؤ اور ہماری بنائی ہوئی دوزخ کو (اور اس میں انواع واقسام کے عذاب کے جو سامان پیدا کئے ہیں، ان کو) دیکھو، چنانچہ وہ گئے، اور جا کر اس کو دیکھا، اور آ کر عرض کیا، خداوندا! آپ کی عزت کی قسم (آپ نے دوزخ کو تو ایسا بنایا ہے، کہ میرا خیال ہے کہ) جو کوئی بھی اس کا حال سنے گا وہ کبھی بھی اس میں نہ جائے گا (یعنی ایسے کاموں کے پاس نہیں جائے گا جو آدمی کو دوزخ میں پہنچانے والے ہیں) اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات اور نفسانی لذات سے گھیر دیا (مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات والے وہ اعمال جن میں انسان کی طبیعت اور نفس کے لئے بڑی کشش ہے، جہنم کے گرد اُن کی باڑہ لگا دی، اور اس طرح جہنم کی طرف جانے کیلئے بڑی کشش پیدا ہو گئی) اور پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل سے فرمایا: اب پھر جا کر اس دوزخ کو دیکھو۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جبرئیل پھر گئے اور

جاکراس کواور اسکے گرد شہوات ولذات کی جو باڑہ لگائی گئی تھی، اس کو) دیکھا اور آکر عرض کیا: خداوندا! آپ کی عزت و جلال کی قسم! اب تو مجھے یہ ڈر ہے کہ سب انسان اسی میں نہ پہنچ جائیں (مطلب یہ ہے کہ جن شہوات ولذات سے آپ نے جہنم کو گھیر دیا ہے ان میں نفس رکھنے والے انسانوں کیلئے اتنی زبردست کشش ہے کہ ان سے رکنا بہت مشکل ہے اور اسلئے خطرہ ہے کہ بیچاری ساری اولادِ آدم نفسانی لذات و شہوات کی کشش سے مغلوب ہو کر دوزخ ہی میں نہ پہنچ جائے)۔ (ترمذی، ابوداود، نسائی)

تشریح...... حدیث کا اصل مقصد اور اس میں ہمارے لئے خاص سبق یہ ہے کہ نفسانی خواہشات جو بظاہر بڑی لذیذ اور بڑی مرغوب ہیں۔ ہم جان لیں کہ ان کا انجام دوزخ کا دردناک عذاب ہے، جس کا ایک لمحہ زندگی بھر کے عیشوں کو بھلا دے گا، اور احکام الٰہی کی پابندی والی زندگی جس میں ہمارے نفسوں کو گرانی اور سختی محسوس ہوتی ہے اس کا انجام اور منتہیٰ جنت ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عیش و راحت کے وہ سامان ہیں جن کی دنیا کے کسی انسان کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

۱۴۰) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا رَأَيْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَا رِبُهَا وَلَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا. (رواه الترمذی)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے نہیں دیکھی دوزخ کی طرح کی کوئی خوفناک بلا، کہ سوتا ہو اس سے بھاگنے والا، اور نہیں دیکھی میں نے جنت کی طرح کی کوئی مرغوب و محبوب چیز، کہ سوتا ہو اس کا چاہنے والا۔ (ترمذی)

تشریح...... انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی بلا سے مثلاً اپنی طرف آنے والے کسی خوفناک درندے سے، یا اپنا تعاقب کرنے والے کسی سخت ظالم اور طاقتور دشمن سے جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے، تو بس بھاگا ہی چلا جاتا ہے، اور جب تک کہ اطمینان نہ ہو جائے، نہ سوتا ہے اور نہ آرام کرتا ہے، اسی طرح جب کسی انتہائی محبوب و مرغوب چیز کے حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرتا ہے تو اثناء راہ میں نہ تو سوتا ہے، نہ چین سے بیٹھتا ہے۔ لیکن دوزخ اور جنت کے بارے میں انسانوں کا عجب حال ہے، دوزخ سے بڑھ کر کوئی خوفناک بلا نہیں، مگر جن کو اس سے بچنے کے لئے بھاگنا چاہئے، وہ غفلت کی نیند سوتے ہیں، اور جنت جس کے حاصل کرنے کیلئے دل و جان سے جدوجہد کرنا چاہئے، اس کے چاہنے والے بھی محو خواب ہیں۔

پڑے غفلت کے پڑگئے ہیں، بلا کی نیندیں امنڈ رہی ہیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونیوالے، کہ حشر تک جاگنا قسم ہے

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پہلی جلد ختم ہوئی۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ

اللہ تعالیٰ باقی جلدوں کی بھی تکمیل اور اشاعت کی توفیق دے

بندہ ناچیز۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ